سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیاتِ اردو شمارہ ۱۶۹

فرخندہ بنیاد حیدرآباد

یعنی

شہر حیدرآباد کے آغاز و ارتقاء
اور حیدرآبادی تہذیب و تمدن کے نشو و نما کی داستان
جس کو تاریخوں اور نیم تاریخی روایتوں اور افسانوں کی شکل میں
اہلِ حیدرآباد سینہ بسینہ اور سفینہ بسفینہ محفوظ رکھتے آئے ہیں۔

از

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
ایم اے۔ پی ایچ ڈی (لندن) معتمد اعزازی ادارۂ ادبیاتِ اردو

داستان ادب حیدر آباد

دوسرا حصہ۔ روایات

حیدر آبادی لیل و نہار کی داستانیں

صفحہ

۱۔ چھلم کی رقاصہ۔ داستان حیدر آباد کا آغاز ۵۹
۲۔ مشک محل۔ دورانِ تعمیر کی ایک جھلک ۶۴
۳۔ مکہ مسجد۔ سنگِ بنیاد کا اہتمام ۶۹
۴۔ کھویا ہوا چاند۔ لنگر کی بنا ۷۴
۵۔ ننھی سانونی۔ محلوں کی زندگی ۸۱
۶۔ بیس ۲/۱ پیسے۔ خادم نوازی ۹۷
۷۔ پانچ اشرفیاں۔ عوام کا خیال اور عوامی تائید ۱۰۴
۸۔ مِلک خوشنود۔ صاحبانِ کمال کی سرپرستی ۱۱۳
۹۔ شہزادی کا عقد۔ صوفیا کا رسوخ ۱۲۴
۱۰۔ کوہِ نور۔ امراء کی غداری ۱۲۹

صفحہ

۱۱۔ شعلۂ انتقام۔ درباری سازشیں ۱۴۲
۱۲۔ سہرۂ صحرا۔ دہقان نوازی ۱۵۶
۱۳۔ انار کے چودہ دانے۔ مزدوروں کی قدر دانی ۱۶۹
۱۴۔ اورنگ زیب اور تاناشاہ ـ حریف کا احترام ۱۷۴
۱۵۔ کاغذی برج۔ فوج کی ہمت و بہادری ۱۷۶
۱۶۔ غیبی امداد۔ فقرا کی تائید ۱۸۱
۱۷۔ آخری سرفروش۔ حبشی سپاہیوں کی قربانی ۱۸۸
۱۸۔ خاصہ کا وقت۔ شکست کے بعد اخلاقی جرأت ۱۹۲
۱۹۔ مٹی کی کلھیا۔ مفلسی میں فیاضی ۱۹۸
۲۰۔ بالا۔ رقاصہ کی وفاداری ۲۰۴

غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

حیدر آباد کی تاریخ کو پلٹا کھائے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ ملکوں اور قوموں کی زندگی میں نشیب و فراز یوں ہی آتے رہتے ہیں۔ حیدر آباد اور اس میں رہتے بسنے والوں کی زندگی میں کئی انقلاب آئے لیکن اتنا بڑا انقلاب اس سے پہلے صرف ایک ہی مرتبہ آج سے ۲۷۳ سال قبل آیا تھا۔ اس وقت بھی شہر اور اہلِ شہر دونوں متاثر ہوئے تھے۔ شہر تو اتنا زیادہ متاثر ہوا تھا کہ اس کی صورت ہی مسخ ہو گئی تھی، لیکن کچھ عرصہ بعد جب آصفی سلطنت قائم ہو گئی تو اس شہر کے گلی کوچوں میں رہنے والوں کی اگلی خصوصیات پھر سے عود کر آئیں اور اس کے باشندے اپنی ان خصوصی روایتوں کو ہمیشہ اپنے سینوں سے لگائے رہے جو اس شہر کے بننے کے بعد سے قطب شاہی بادشاہوں، امیروں، فن کاروں اور علم و ادب کے خدمت گزاروں نے سالہا سال کی محنت اور عرق ریزیوں سے قائم اور جاری کی تھیں۔

یوں تو اس شہر کی عمر دنیا کے قدیم شہروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ نہیں ہے۔ پھر بھی اس نے اب تک اپنی زندگی کے ۳۶۲ سال ختم کر لئے ہیں اور اس تمام عرصے میں حسنِ اتفاق سے یہ ایسے صاحب کمالوں، فن کاروں اور اہلِ ذوق انسانوں کا مرجع رہا ہے جنھوں نے اس مرز بوم کو ایک خاص تمدن اور معاشرت کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ ایک ایسی تہذیب اور شائستگی یہاں

پیدا ہو گئی کہ اس ملک کے جملہ باشندوں میں خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں معاشرتی اور تمدنی نقطۂ نظر سے کوئی فرق باقی نہ رہا اور یہ باہم شیر و شکر ہو کر قابلِ رشک امن و اطمینان کے ساتھ اس میں گذر بسر کرتے رہے۔

یہ شہر شروع ہی سے ایک انفرادی خصوصیت اور یک گونہ خود پسند معاشرت کا مرکز رہا ہے اور جو لوگ دوسرے مقامات سے اس شہر میں وقتاً فوقتاً آتے اور اس میں بستے رہے وہ بھی نہ صرف اس رنگ میں رنگے گئے بلکہ اس میں اضافہ کرتے گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حیدرآباد بادشاہت اور مطلق العنان حکمرانی کے معائب اور محاسن دونوں کا مکمل مرقع رہا ہے۔ علم و ہنر، فضل و کمال اور فنونِ لطیفہ کی قدردانی اور نشو و نما کے لیئے گذشتہ ایک صدی میں ہندوستان کی ایسی بادشاہتوں اور ان کے حکمرانوں یعنی راجوں اور نوابوں نے جو خدمات انجام دی ہیں، ان کو ہندوستان کبھی نہ بھلا سکے گا۔ اگر ازمنہ وسطیٰ کی یادگار یہ شخصی حکومتیں نہ رہتیں اور صاحبانِ کمال کی قدر افزائی نہ کرتی ہوتیں تو گذشتہ سو دو سو سال کے مغربی تسلط میں مشرق کے بچے کھچے فنونِ لطیفہ بھی بالکل ناپید ہو جاتے۔

ہندوستان پر یورپی تسلط کے زمانہ میں حیدرآباد کے حکمرانوں اور ہندو اور مسلمان امیروں نے اس خصوص میں جو کام انجام دیئے ہیں وہ کسی دور میں بھی بھلائے نہ جا سکیں گے۔ ناصر جنگ شہید، ارسطو جاہ، میر عالم، چندو لال، شمس الامراء، نریندر پرشاد مختار الملک، کشن پرشاد، خانخاناں، رائے رایاں اور شیو راج کے افرادِ خاندان نے مختلف علوم و فنون کے صاحبانِ کمال کو جس طرح سرفراز اور شاد کام کیا اور اس طرح علم و ہنر اور فنونِ لطیفہ کی بہت سی بجھتی شمعوں کو روشن رکھا اس کی تفصیلات بیان کرنے کے لیئے کئی ضخیم جلدیں درکار ہوں گی۔

حیدر آباد کے حالیہ انقلاب کے وجوہ و علل پر غور کرنے سے اس امر کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی ہے کہ اس شہر کی جسے بجا طور پر ریاست کا دل کہا جا سکتا ہے' قدیم تاریخ اور اس کی روایات کو اہلِ شہر کے پیش نظر کر دیا جائے تاکہ وہ محسوس کریں کہ ان کا شہر مذہب و ملت اور زبان و نسل کی رنگارنگی کے باوجود کس طرح صدیوں سے امن و اعتماد' باہمی رواداری اور یک رنگی کا مخزن اور مرجع رہا ہے۔ ان کو معلوم ہو کہ اس شہر کا آغاز ہی ہندو مسلم میل جول اور یگانگت کا نتیجہ تھا اور اس کے آباد ہونے کے بعد سے اب تک اس کے باشندے کس طرح باہمی لطف و مروت کے ساتھ ایک خاص شائستگی اور شگفتہ انداز میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ وہ جان لیں کہ حیدر آباد باسیوں کی ایک خاص تاریخ ہے۔ خصوصی روایتیں ہیں اور ان کے خواص و عوام کے سوچنے اور سمجھنے کے ڈھنگ غیر معمولی طور پر یکساں اور نمایاں رہے ہیں۔ اگر عہد حاضر کے حیدر آبادی اس صورت حال پر غور کریں اور آگے قدم بڑھائیں تو یقین ہے کہ پہلے انقلاب کے بعد جس طرح اس شہر نے تہذیب و تمدن کی قدیم روایتوں کو برقرار رکھا اور پھر سے جاری کر لیا' اس عبوری دور کے گزرنے کے بعد پھر وہی شائستگی تہذیب و ترقی اور رواداری رونما ہو جائے گی۔ صحیح انداز میں تھوڑا سا غور حیدر آبادیوں پر ان کی پچھلی خصوصیات کو جن کی وجہ سے وہ ہمیشہ نمایاں اور ممتاز رہے ہیں' ظاہر کر دے گا اور قوی امکان ہے کہ وہ رواداری میں لگائے جانے والے مختلف نعروں کا شکار نہ بنیں' جن پر اگر عمل کیا گیا تو وہ نہ صرف اپنا مقام کھو بیٹھیں گے بلکہ سابقہ خصوصیات کو بھی دفن کر دیں گے۔

اگر یہ کتاب اپنے اس نیک مقصد میں کامیاب نہ بھی ہوئی تو کم از کم اتنا یقینی ہے کہ اس کے ذریعہ سے گزرے ہوئے حیدر آباد کی تاریخ اور روایات محفوظ ہو جائیں گی۔ حیدر آبادی حیدر آباد میں ہوں یا حیدر آباد سے باہر اس کتاب کو اپنی حیاتِ ماضی کی ایک یادگار سمجھیں گے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لئے اپنے وطنِ عزیز کا یہ مرقع بطور تحفہ چھوڑ جائیں گی۔

یہ کتاب دراصل ۱۹۴۹ء میں قلمبند کی گئی اور حسب ذیل چھے حصوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ حیدرآباد کی تعمیر اور خوبیاں۔ ۲۔ حیدرآبادی لیل و نہار کی داستانیں۔

۳۔ حیدرآباد میں ادب اور شاعری۔ ۴۔ حیدرآبادی تہذیب و تمدن کے معمار۔

۵۔ حیدرآباد میں رفاہ عام کے کام۔ ۶۔ حیدرآباد کے سیاح اور ان کے ارتسامات۔

ابتدا میں خیال تھا کہ ان سب کو ایک ساتھ ایک ہی جلد میں شایع کیا جائے۔ اور اس طرح حیدرآباد سے متعلق ایک ہزار صفحات کا یہ مرقع اس فرخندہ بنیاد کی گزشتہ زندگی کی ایک مکمل یادگار ثابت ہو۔ لیکن جن مختلف اسباب کی بنا پر یہ خیال پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو کا موازنہ اتنی بڑی باتصویر کتاب کی بیک وقت اشاعت کا بار نہ اٹھا سکتا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس انقلاب کے بعد اہل حیدرآباد اور اہل اردو دونوں اس قابل نظر نہ آئے کہ اتنی قیمتی کتاب خرید سکیں۔ اس لئے جنوری ۱۹۵۱ء میں اس کا تیسرا حصہ جو ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے داستان ادب حیدرآباد کے عنوان سے کتابی صورت میں شایع کر دیا گیا اور اردو دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ چنانچہ اس کی نسبت مشاہیر علم و ادب کی بعض رایوں کا انتخاب اس کتاب کے آخر میں درج کیا جا رہا ہے۔

یہاں اس واقعہ کا اظہار بھی ضروری ہے کہ زیر نظر کتاب کا حصہ دوم زیادہ تر ان نیم تاریخی افسانوں پر مشتمل ہے جو راقم الحروف کے افسانوں کے مجموعوں (سیر گولکنڈہ اور گولکنڈے کے ہیرے) میں آج سے پندرہ بیس سال قبل شائع ہوئے اور اتنے مقبول ہوئے تھے کہ یہ دونوں مجموعے عرصہ سے نایاب ہیں۔ لیکن دکنی روایات کو تازہ رکھنے کے لئے عہد حاضر میں ان کی اشاعت ضروری تھی۔

اب آخری تین حصے باقی رہ جاتے ہیں اور جب پہلے تین حصوں کی طباعت چار سال بعد عمل میں آئی ہے تو نہ معلوم بالقی نصف کتاب کب تک شایع ہو۔ جب کہ ایک طرف تو ادارہ ادبیات اردو کی آمدنی کے ذرایع رفتہ رفتہ مسدود ہوتے جا رہے ہیں اور دوسری طرف اردو کتابوں کی مانگ اور قدر و قیمت روز بروز گھٹتی جا رہی ہے۔ توقع ہے کہ یہ عبوری دور بہت جلد گزر جائے گا اور اردو ہندستان میں رفتہ رفتہ اپنی صحیح قدر و قیمت حاصل کر لے گی اور اہل اردو کا احساس پستی بالآخر رفع ہوگا اور وہ اس زبان کی بقا اور ترقی میں پہلے سے زیادہ سرگرم عمل ہو جائیں گے۔

حیدرآباد کی تعمیر اور خوبیاں

آغاز

۹۹۹ھ

حیدرآباد ایک عجیب و غریب شہر ہے! اس کا چپہ چپہ اپنے اندر سیکڑوں دلکشیاں رکھتا ہے۔ اس کی تاریخ اس کا تمدن، اس کی معاشرت، اور اس کی روایات غرض ہر چیز ذوق رکھنے اور مطالعہ کرنے والے کے لئے گوناگوں دلچسپیوں کا باعث ثابت ہوتی ہے۔ بہت کم شہر ہوں گے جہاں طرز معاشرت میں، گلی کوچوں میں، سمتوں اور محلوں میں، اور خود باشندوں میں ایسا شدید "جزر و مد" اور ایسی بلند و پست "بوقلمونی" پائی جاتی ہو۔ کوئی نسل ایسی نہیں جس کے نمایندے یہاں نہ رہتے ہوں۔ شاید ہی کوئی زبان ہو جو یہاں بولی نہ جاتی ہو۔ یہاں کے محل، اور جھونپڑیاں، بنگلے اور باغات اور سڑکیں اور گلیاں اپنی اپنی طرزِ تعمیر اور اپنی تاریخی خصوصیتوں کے لحاظ سے اس شہر کو ایک "عجائب گاہ" بنا رہے ہیں۔

جتنی اِس "فرخندہ بنیاد" میں ماضی کی عظمتیں حال و مستقبل کی تابناکیوں اور جدّت طرازیوں کے ہم پہلو ہیں شاید ہی صفحۂ ہستی کی کسی اور آبادی میں پائی جاتی ہوں!

یہ شہر حیدرآباد سلطنتِ قطب شاہیہ کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے لحاظ سے دسویں صدی ہجری کے اواخر میں خود بخود آباد ہونے لگا تھا۔ کیونکہ اس سلطنت کے پایہ تخت گولکنڈہ میں مزید آبادی کی گنجایش نہ رہی تھی اور سب سے پہلے وہاں کے امراء نے اس قلعہ کے اطراف و جوانب میں اپنے لئے باغ اور شبستان تعمیر کرنے شروع کر دیئے تھے۔ خاص کر قلعہ کی جانبِ مشرق موسیٰ ندی کے کنارے کنارے یہ آبادی بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ۹۹۹ھ میں سرکاری طور پر ایک عالی شان

شہر کا سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ شہر جس جگہ آباد کیا گیا اس کے محلِ وقوع کے بارے میں تاریخ قطب شاہی میں لکھا ہے ؎

لطیف و دلکشا آب و ہوا ے　　　　مبارک منزلے فرخندہ جائے

اگرچہ حیدر آباد جیسے وسیع شہر کی زد میں کئی قصبے اور گاؤں آ گئے ہوں گے[1] لیکن جس جگہ اب چار مینار واقع ہے وہاں وہ موضع چچلم واقع تھا جس میں بعض تاریخوں کے بیان اور مشہور روایتوں کے مطابق بھاگ متی رہا کرتی تھی۔ اور محمد قلی نے اس کی محبت کی یادگار کے طور پر بھاگ نگر کو بسایا تھا اور جب بعد کو بھاگ متی کو حیدر محل خطاب دیا تو شہر کا نام بھی بدل کر حیدر آباد رکھ دیا۔

محمد قلی نے اس عظیم الشان شہر کی تعمیر جس ولولہ اور بے تابانہ شوق سے کی اور اس کی جلد سے جلد تکمیل و آبادی کے لئے جو کوششیں کی گئیں اس کا اندازہ خود محمد قلی کے کلام سے ہوتا ہے چنانچہ وہ ایک جگہ مناجات میں خدائے تعالیٰ سے جہاں بہت سی باتوں کی التجا کرتا ہے اپنے شہر کی معموری کے لئے بھی دعا کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اپنے آباد کئے ہوئے شہر سے کتنی محبت تھی اور وہ اس کی آبادی اور آرائش و زیبائش کے لئے کتنا بے چین تھا۔ وہ کہتا ہے کہ :-

"اے خدا تو میرے شہر کو لوگوں سے اسی طرح معمور کر دے جس طرح تو نے سمندر میں مچھلیاں بھر دی ہیں۔"

بڑی اچھی مناجات لکھی ہے جس کے چند شعر ہیں ؎

مناجات میرا تو سن یا سمیع　　　　منجے خوش توں رکھ راتوں یا سمیع

(منجے = مجھے، توں = تو)

---

[1] شہر حیدر آباد کی وسعت اور شادابی کا اندازہ تاریخ ظفرہ کے حسب ذیل بیان سے ہو سکتا ہے:-



بھاگ متی حیدر محل مالکۂ حیدرآباد

مرے دوستاں کوں توں نت دے (ہمیشہ جنت) — مرے دشمناں کوں اگن (آگ) یا سمیع
اباداں کر ملک میرا سو توں — بسا سو توں وے میراں امن یا سمیع
سکل (سب) تخت پر میرا یوں تخت کر — انگوٹھی پہ جوں ہے نگین یا سمیع
مرا شہر لوگاں سوں معمور کر — رکھیا جوں توں دریا میں مِن (مچھلی) یا سمیع
مرادات کا جم ترنگ سار قطبؔ — اُسے سار ہت دے عنین یا سمیع

محمد قلی کی جملہ دعائیں مقبول ہوں یا نہ ہوں اس کی یہ دعا تو ضرور قبول ہوئی کہ اس کا بسایا ہوا شہر بڑے بڑے انقلابوں کے بعد بھی اسی طرح آباد ہے۔ اس شہر کی آبادی کے پچیس سال بعد ہی ایک مورّخ نے اس کی نسبت یہ خیال ظاہر کیا تھا جو ایک سچی پیشین گوئی ثابت ہوا۔

شہرے چو بہشت در نکوئی — یابی تو در و ہر آں چہ جوئی
گر پیر بدید نش شتابد — زو عمر گزشتہ باز یابد
زو ہر چہ نکوست کم نہ یابی — یابی ہمہ چیز و غم نہ یابی

تاریخ قطب شاہی کے یہ الفاظ آج بھی اس شہر کے حسب حال ثابت ہوتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

"کثرت خلائق و وفور بدائع مواضع و فراوانی باغ و بساتین بدرجہ انجامید کہ ساحتِ کوہ و دشت سمت تضائق پذیرفت۔ چنانچہ از دارالسلطنت حیدرآباد تا قصبۂ نرکھوڑہ، ابراہیم پٹن و بھونگیر و پٹن چرو کہ در چہار جہت واقع است و مساحت بقدر دہ فرسنگ است مجموعۂ فضائے دشت و صحرا باغ و بستاں شدہ و کثرت احداثِ مساجد و بقاع و سرائے دلکش و نزاہت ریاض فردوس وش غیرت افزائے سپہر اخضر گردید" (ص ۱۰)۔

چارمینار اور چار بازار

سنہ ۱۰۰۰ھ

محمد قلی قطب شاہ نے سب سے پہلے شہر کے وسط میں چارمینار[1] کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ عمارت ۱۸۶ فیٹ بلند ہے۔ اور اس کے اوپر ایک مسجد اور مسجد کے ساتھ ایک حوض بنایا گیا تھا جس میں تالاب جل پلی سے پانی پہنچایا گیا۔ اوپر کا یہ حوض اسوقت باقی نہیں ہے لیکن یہ ۱۱۸۵ھ تک موجود تھا چنانچہ تاریخ ظفرہ میں لکھا ہے کہ:۔ "حوضے است در غایت لطافت وصفا۔ آب نہر تالاب جلپلی در آں میرسد"[1]

چارمینار کی وجہ تعمیر میں تعزیہ کو دخل ہو یا نہ ہو اس کا روضۂ حضرت امام رضاؑ علیہ السلام کی طرح شہر کے وسط میں بنایا جانا اور اس کے چاروں طرف بڑی بڑی سڑکوں اور بازاروں کی تعمیر میں حضرت میر محمد مومن پیشوائے سلطنت کے مشورہ کو دخل ہوگا۔ کیونکہ میر صاحب جیسے متقی پیشوائے سلطنت کی موجودگی میں شہر کی بنیاد کے وقت کسی مذہبی تقدس یا مناسبت کا خیال پیدا ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ چارمینار کے تعزیہ نما ہونے (اور حضرت امام رضا کے مرقد منور کی طرح شہر کے وسط میں اس طرح بنائے جانے کہ اس کی چاروں طرف سے سڑکیں آکر ملتی ہوں) کے علاوہ اس کے بلند ترین حصہ میں ایک نہایت خوش نما وسیع مسجد کی تعمیر اس خیال کو ظاہر کرتی ہے کہ شہر میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ بلندی پر خانہ خدا کا تعمیر کیا جانا ضروری ہے اور ایسا اعلیٰ اور پاکیزہ تخیل میر مومن جیسے پیشوائے کل ہی کے ذہن میں پیدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اسی مسجد کی وجہ سے یہ عمارت زوال گولکنڈہ کے بعد

---

[1] یہ مربع عمارت شہر کے تقریباً وسط میں پتھر اور گچ سے بنائی گئی۔ اس کے چاروں رُخ بھی تقریباً چاروں

باقی برصفحہ آئندہ

منہدم کر دئے جانے سے بچ گئی۔[1]

واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف چار مینار بلکہ محلاتِ شاہی اور دیگر خاص خاص عمارتوں کے محلِ وقوع کے تعین اور جگہ کے منحوس و مسعود ہونے کے بارے میں بھی میر محمد مومن کی روحانی اور عملیاتی قوتوں سے مدد لی گئی تھی۔ اس کا ایک ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ جب دیوان خانۂ عالی تیار ہونے لگا اور اس کی جانب شرق ایک ایک ہزار گز لانبا اور اتنا ہی چوڑا جلوخانہ بن گیا تو اس عظیم الشان جلوخانہ کے چاروں پہلوؤں کے وسط میں ایک ایک کمان بنائی گئی جس کی بلندی تیس گز رکھی گئی تاکہ بڑے سے بڑا ہاتھی اونچی سے اونچی عماری اور بلند سے بلند فوجی نشان کے ساتھ ان کمانوں میں سے گزر سکے۔ ان میں سے جو کمان دولت خانۂ عالی کی طرف تھی اس میں ۶۰ فیٹ بلند اور ۶ فیٹ چوڑے نشیب کی طرح سیاہ و مصفیٰ ڈونگ خار اکھڑے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ اسمات (شمال، جنوب، مشرق اور مغرب) کے موافق قائم کئے گئے ہیں۔ ہر سمت ۶۰ فٹ عریض ہے اور اس کے مینار تقریباً ۱۹۰ فٹ بلند۔ وسطی عمارت تیس فٹ عریض اور چوبیس فٹ بلند چار محرابوں پر مشتمل ہے جن کے درمیان گنبد نما چھت ہے۔ اس چھت پر دو منزلہ عمارت بنائی گئی جس کی پہلی منزل پر مدرسہ اور خانقاہ اور دوسری پر مسجد اور حوض تعمیر کیا گیا۔ ان پر پہنچنے کے لئے چاروں میناروں میں زینے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ مسجد و مدرسہ و خانقاہ باہر سے نظر نہیں آتے کیونکہ ان کے اطراف خوش وضع کمانیں باہر کے رخ پر کچھ اس طرح بنائی گئی ہیں کہ اندر کی حالت ظاہر نہیں ہونے پاتی اور عمارت کے بیرونی پہلوؤں کا حسن اور تناسب بھی باقی رہتا ہے۔

چار مینار کی تعمیر میں ایک روایت کی رو سے تین لاکھ اور دوسری کے مطابق دو لاکھ باون ہزار ہون یعنے دس بارہ لاکھ روپے صرف ہوئے۔ یا حافظ سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔

[1] شفیق نے احوال حیدرآباد میں اورنگ زیب کے حکم سے داد محل کے ساتھ چار مینار کے انہدام کے آغاز اور پھر مسجد

باقی بر صفحہ آئندہ

کر کے اور ان کے اوپر ایک اور پتھر رکھ کر باب عالی کی چوکھٹ بنائی گئی جس میں صندل، ہاتھی دانت اور سونے کا ایک دروازہ لگایا گیا۔ جس کسی شخص کو محل و دیوان خانۂ شاہی میں جانا ہوتا تو اس دروازہ میں سے ہو کر گزرنا ضروری تھا۔ اس لحاظ سے تمام شہر میں اس دروازہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ حضرت میر محمد مومن نے اسی اہمیت کے پیش نظر اس دروازہ کے سامنے ایک پتھر کا ستون گاڑ دیا تھا جس پر ایسے طلسم وغیرہ منقوش کر دئے تھے جن کی وجہ سے ہر اُس شخص کا اثر زائل ہو جاتا تھا جو خراب ارادوں کے ساتھ بادشاہ کے یہاں جانا چاہتا۔ اسی وجہ سے اِس کمان کا نام "کمان سحرِ باطل" مشہور ہو گیا اور اب تک یہ اسی نام سے مشہور ہے۔ حالانکہ نہ اب وہ طلسمی پتھر باقی ہے اور نہ صندل اور سونے کا دروازہ۔

چارمینار کے ساتھ ہی شہر میں چار بازار ترتیب دئے گئے جن میں چودہ ہزار دکانیں بنائی گئیں۔ گلزار آصفی میں لکھا ہے کہ :۔

"امر فرمود کہ وست بدست بنائے شہر مشتمل بر چہار بازار و بر سرِ ہر بازار طاق و رواق با چہاردہ ہزار دکاکین و ایوان و سائبان و دوازدہ ہزار محلہ بنسادی الاضلاع باحداث در آرند۔" (ص ١٩)

محمد قلی نے متعدد حمام، مسجدیں، عاشور خانے، لنگر خانے، مدرسے، مہمان خانے، کارواں سرائیں، اور دواخانے بھی بنائے تھے۔ جن میں سے چند حماموں، اکثر مسجدوں اور عاشور خانوں، متعدد کارواں سراؤں اور شاہی دار الشفا کی عمارتیں یا اُن کے آثار اب تک باقی ہیں۔ اور اس شکستہ حالت میں بھی ظاہر کرتے ہیں کہ محمد قلی کس اعلیٰ ذوق اور شان :

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ کی وجہ سے محفوظ رہ جانے کا تفصیل سے تذکرہ لکھا ہے۔



چارمینار

شوکت کا بادشاہ تھا۔ وہ نزاکتوں سے زیادہ شکوہ اور بڑائی کا دلدادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد اور گولکنڈہ کی اکثر عمارتیں جسامت، مضبوطی، بلندی کی وجہ سے ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن اس مضبوطی اور بلندی کے ساتھ ساتھ خوبصورتی اور لطافت کا بھی خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا۔ چنانچہ ابوالقاسم فرشتہ جس نے اکبر اعظم کے بنائے ہوئے آگرہ، لاہور اور فتح پور سیکری جیسے عظیم الشان مغلیہ شہروں میں بود و باش کی تھی حیدرآباد کے متعلق لکھتا ہے:۔

"شہرے کہ در تمامیِ ہندوستان شرقاً، غرباً، شمالاً و جنوباً مثل آں در لطافت و صفا ہرگز یافت نمی شود" (تاریخ فرشتہ مقالہ سوم ص۱۴۳)

اس کے آگے لکھتا ہے:۔

"دورِ او قریب پنج کردہ است۔ بازارہا بہ خلاف سایر بلادِ ہندوستان بطرح واقع شدہ درغایت وسعت و صفا بخلاف آب و ہوا تندرست دارد و با مسافر و مجاور دم در موافقت و سازگاری میزند و اکثر بازارہائے او از طرف جدول ہائے آب روانی است و در کنار جدول ہا درختان سایہ دار نشاندہ و دکاکین را در کمال مطبوعی از گچ و سنگ ساختہ اند۔ منازل بادشاہی بنوعی ساختہ و پرداختہ شدہ است کہ مسافران اقالیم سبعہ قرین آں در ہیچ ملک نشان نمی دہند۔"

موسیو تیورنیر فرانس کا رہنے والا تھا جس کا پایہ تخت پیرس قدیم زمانہ ہی سے عروس البلاد سمجھا جاتا ہے۔ یہ جب حیدرآباد آتا ہے تو اپنے سیاحت نامہ میں لکھتا ہے کہ:۔

"شہر نہایت سلیقہ سے بنایا گیا ہے اور اس میں بڑے بڑے راستے ہیں۔۔۔۔۔ چار پانچ کارواں سرائیں موجود ہیں جو دو منزلہ ہیں۔۔۔۔۔۔" (جلد اول ص۱۲۳)

آخر میں حدیقۃ العالم کا ایک بیان نقل کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس کے مطالعہ سے سلطان محمد قلی کے ذوق تعمیر اور شہرِ حیدر آباد کی ابتدائی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے:—

"در ہر بازارے چند چہار سو کہ بہ ہندی چورا ہا گویند متساوی الاضلاع وسوائے آں بازار ہائے دیگر........ دکاکین چہار دہ ہزار گفتہ اند، در پیش ہر دکان ایوانے، وماورائے ایں از محلہ ہا، وحمام ہا، و خانقاہ، و مدرسہ و مسجد و لنگر و مہمان خانہا۔ دو دو از دہ ہزار مکان برلوح مہارت کشیدند........ مجموع عمارات کوچہ و بازار وغیرہ را از سنگ و آہک بہ تکلف ہر چہ تمامتر بر آوردند۔ و منازل بادشاہی بہ نوعے ساختند کہ مسافرانِ اقالیم سبعہ نظیرِ آں در ہیچ ملک نشان نمی دہند۔" (مقالہ اول ص۲۱۵)

دولت خانۂ عالی

بازار اور محلّے جس شوق سے تعمیر کئے گئے اس کا ذکر تو گذر چکا ہے اب قصروں کی تعمیر کے سلسلہ میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ سب سے پہلے چار مینار کی جانب شمال مغرب **دولت خانۂ عالی** بنایا گیا جس کے جلو خانہ میں چاروں طرف چار بلند کمانیں کھڑی کی گئیں اور وسط جلو خانہ میں ایک ہشت پہلو حوض، تاکہ فوجیوں اور ان کے جانوروں کو ہر وقت کافی پانی میسر آسکے۔ اس جلو خانہ کے مغرب کی طرف محلاتِ شاہی کی بنیاد رکھی گئی۔ چنانچہ اس طرف کی کمان دروازۂ دولت خانۂ عالی یا دروازۂ شیرِ علی کہلاتی تھی۔ اس کمان میں جیسا کہ ابھی لکھا گیا ۶۰ فیٹ بلند اور ۶ فیٹ چوڑے یشب کی طرح سیاہ و مصفّٰی دو سنگِ خارا کھڑا کر کے اور ان کے اوپر ۲۶ فیٹ کا ایک اور پتھر رکھ کر بابِ عالی کی چوکھٹ بنائی گئی۔ اس چوکھٹ میں صندل ہاتھی دانت، اور سونے کا ایک دروازہ لگایا گیا۔ اس دروازہ سے اندر داخل ہوتے تو ایک وسیع فضا میں کئی قصر نظر آتے۔ یہاں جنوب کی طرف دفتر خانۂ شاہی اور مغرب کی طرف جامدار خانہ اور کارخانہائے عامرہ وغیرہ بنائے گئے۔ اس وسیع فضا میں جانبِ شمال ایک دوسرا دروازہ لگایا گیا تھا جس میں داخل ہونے کے بعد ایک اور وسیع میدان ملتا ہے جس کے چاروں طرف لشکریوں، حوالداروں، شب نویسوں اور سلحداروں کے لئے بڑے بڑے ہال یا ایوان بنے ہوئے تھے۔

ان سے گذرنے کے بعد چندن محل بنایا گیا جو ایک "عمارتِ رفیع و دلکشا" تھی۔ اس محل میں بھی چند سلحدار نوبت بہ نوبت جمع رہتے۔ چندن محل کے آگے گگن محل تعمیر کیا گیا۔

جو نہایت وسیع تھا اور اس میں خاص ترک، عرب اور دکنی سلحدار حاضر رہتے اس کے بعد صدر صفہ تھا جس میں مقرب و معتبر ملازمانِ قدیم ہی ٹھہر سکتے تھے۔ صدر صفہ کے بعد سجن محل ملتا تھا جو نہایت خوبصورت اور عالی شان عمارتوں پر مشتمل تھا جن میں اعیان و فضلاء مقام کرتے تھے۔ اس محل کی جانبِ مشرق تین سو فیٹ طویل ایک ہال تعمیر ہوا جس میں رات اور دن مطبخِ شاہی سے ہر قسم کے کھانے پک کر آتے اور تقریباً دس ہزار مجلسی، سادات، علما، فضلاء اور امراء ہر روز اس شاہی دستر خوان پر کھانا کھاتے۔

سجن محل

یہ اُن مجموعۂ محلات میں سے ایک تھا جو شہر کے وسط میں تعمیر کئے گئے تھے اور جس کو دولت خانۂ عالی کہتے تھے اور جس کی تعمیر اور خصوصیتوں کی تفصیل کا بیان اوپر گزر چکا ہے۔

سجن محل کے بارے میں مورخین لکھتے ہیں کہ:۔

"درگاہِ ہفتم سجن محل است۔ عمارتِ عالی مقدار باصفا کہ بہ رشکِ فردوسِ بریں بروئے زمین تزئین یافتہ جمعے از اعیان و فضلا در آں مکان مقام دارند" (تاریخ ظفرہ ص۱۴)

اِسی سجن محل سے متصل جانبِ مشرق ۳۰۰ فیٹ لانبا وہ مشہور و معروف ہال تھا جہاں صبح و شام مطبخ شاہی سے ہر قسم کے کھانے پک کر آتے اور دس ہزار اشخاص (جن میں زیادہ تر سادات، علما، فضلاء، امرا اور مجلسی شریک تھے) ہر وقت شاہی دستر خوان سے بہرہ مند ہوتے۔

سجن محل کے متعلق محمد قلی نے جو نظم لکھی ہے اس میں محل سے زیادہ اُس نازنین کا تذکرہ کیا ہے جو اس محل میں اس کے دل پر قابض ہوگئی تھی۔ اس نظم کے مطالعہ سے مورخوں کی وہ توضیح مشتبہ ثابت ہوتی ہے کہ اس محل میں اعیان و فضلا ٹھہرا کرتے۔

یہ محل اصل میں شاہی زنانہ محل تھا جیسا کہ خود نام سے بھی ظاہر ہے۔ مزید ثبوت خود یہ نظم ہے جس میں بادشاہ لکھتا ہے کہ:۔

"میری پیاری سجن محل میں بن سنور کر ناز و غمزہ کے ساتھ آئی۔ اور میری جان جاں بن کر اس نے مجھے زندگی کا پیالا پلایا۔ اس کا اثر میرے سر میں پھر سے چڑھ گیا ہے۔ کیونکہ پھر اس نے اپنی خماری آنکھوں کی بھٹی ناز سے چڑھائی ہے۔

اس نے اپنے بالوں میں چاند اور سورج اور تاروں کی طرح پھول گوندھے ہیں۔ ان پھولوں اور ان بالوں سے مجھے ایک دوسرا آسمان نظر آنے لگا۔

بھووں میں گرہ ڈال کر مجھ سے کہتی ہے کہ پیالا پیو اور اپنے ہونٹوں کے نُقل کے ساتھ مجھ کو ملائی کھلاتی ہے۔

اپنے گلابی گالوں پر اس نے پھولوں کا طرہ گوندھ کر لگایا ہے اپنے گلے میں نورتن کے ہار ڈالے ہیں اور اپنے آنچل کی چمک میں سو ہزاروں بجلیوں کا منظر پیدا کر دیا ہے۔

سجن محل اس وقت لٹ گیا جب سلطان عبداللہ کے عہد میں مغلوں نے حیدرآباد پر اچانک حملہ کیا اور بادشاہ کو یکایک محلات چھوڑ کر قلعہ گولکنڈہ میں پناہ لینی پڑی اور حملہ آوروں نے حیدرآباد کے شاہی محلات کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

اعلیٰ محل اور حیدر محل[1] کی نظموں میں محمد قلی قطب شاہ نے بجائے محل کی زیب و زینت

---

[1] حیدر محل کا نام حیدر منڈوہ بھی تھا اور یہ بھی سیر و تماشا اور تفریح کے لئے کام آتا تھا۔ (گلزار آصفیہ ص۲۰)

باقی بر صفحہ آئندہ

اور خصوصیات کا بیان کرنے کے اعلیٰ سکی اور حیدرآ بپاری کی تعریف کے گن گائے ہیں اسی طرح قطب مندر کی نظم میں بھی زیادہ تر اپنے محبوبوں کی تعریف اور اپنی محفلوں کی رونق کا ذکر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "اس کے محلوں میں ہر جگہ آئینے لگے ہوئے تھے اور موتیوں کا فرش رہتا تھا۔ اور اس کی بیگمات راتوں کو چاند کی طرح چمکتیں اور باتوں باتوں میں شراب کے پیالے پی جاتیں۔ ان کی آنکھوں کی ضیاء آسمان تک پہنچ جاتی اور یہ آنکھیں باغ فردوس کو قطب مندر کے مقابلہ میں ہیچ دیکھ کر ہنسنے لگتیں۔ جواہرات ان کے نورتن جیسے جسموں پر رہکر خوشیاں مناتے۔"

حنا محل معلوم ہوتا ہے کہ اس محل میں بھی محمد قلی ایک عرصہ تک فروکش رہا اور بقرعید کی محفل اسی میں سجائی تھی۔ وہ عید قربان کی نظم کے آخر میں کہتا ہے :۔

"اے قطب شاہ تو نے نبی کے صدقے میں حنا محل میں عشرت کو پکڑ کر بسا دیا ہے۔"

اس کا شعر ہے ؎

صدقے نبیؐ کے قطبا خناں محل میانے — عشرت پکڑ بسایا صلوات بر محمدؐ

خناں محل اصل میں حنا محل ہے۔ یہ محل اُس جگہ بنایا گیا جہاں اب سرکاری زنانہ دواخانہ یا وکٹوریہ زچگی خانہ واقع ہے۔ یہ اصل میں محمد قلی کے سپہ سالار ملک امین الملک کا باغ تھا اور اسی لئے امین باغ کے نام سے کئی سو سال سے مشہور ہے۔ اور اب بھی بعض پرانے لوگ اس کو امین باغ ہی کہتے ہیں۔ ملک امین الملک کا باغ ندی کے کنارے سے لیکر خداداد محل اور دولت خانہ عالی تک پھیلا ہوا تھا۔ غالباً ملک امین الملک کے انتقال کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ اس باغ میں ایک **حنا محل** بنایا جائے چنانچہ ایک جھیل کے اندر ایک مکمل عمارت تیار کر دی گئی۔ اس کے متعلق

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ یہ خداداد محل کا پانچواں طبقہ "حیدری محل" نہیں بلکہ ایک بالکل دوسرا محل تھا۔

لکھا ہے:—

"معماران در مدت یک ماہ قصر مکمل "حنا محل" را در حسن تقطیع بغایت وسیع اساس نہادہ غیرت افزائے فردوس بریں و رشک پیرائے نگارخانۂ چین ساختند۔"

قطعہ

زاں رفیع آمد چو قصر چرخ ایں عالیمقام — کز علوِ قدر بانی بازمی گوید بنا
از ہوائے او صبا بوئے گرفتہ میدہد — خاک را پیرانہ سر بوئے جوانی از حنا
اہلِ دولت را فضائے دلکشائے او بود — در لطافت ہمچو جنت دلفروز و جانفزا (تاریخ ظفرہ[19])

داد محل اور دوسرے محلات

۱۰۰۲ھ

دولت خانۂ عالی کی عمارتوں کے ساتھ ساتھ محمد قلی نے ایک **داد محل** بھی بنایا تھا جو انہی محلات کی پشت پر یعنی مغرب اور جنوب کی طرف بنایا گیا تھا اور قلعہ گولکنڈہ سے جو سڑک چارمینار کو آتی ہے اس کی طرف اس کا رُخ رکھا گیا تھا۔ حیدر آباد کے موجودہ محلہ چوک و شاہ گنج و محبوب گنج کی جگہ قطب شاہی دور میں ایک وسیع میدان تھا جس کے درمیان ایک عالی شان حوض ۸۰ فیٹ طویل اور ۲۰ فیٹ عریض بنایا گیا تھا اور اس میدان کے اطراف بازار بنائے گئے تھے۔

داد محل کا رخ اسی میدان اور بازاروں کی طرف رکھا گیا چنانچہ اس کے وسیع ایوانوں کے دروازے اسی طرف کھول دیئے گئے تھے تاکہ مظلوموں اور آفت رسیدوں کو بلا روک ٹوک بادشاہ کی نظروں کے سامنے پہنچنے میں سہولت ہو۔ اور وہ اعیان و اکابر و دربانانِ شاہی کے توسط کے بغیر راست سلطان محمد قلی کی بارگاہ میں پہنچکر اپنا دکھڑا بیان کر سکیں اور بادشاہ اکثر اسی کے بیرونی جھروکے میں بیٹھا رہتا تھا۔

داد محل چار منزلہ تھا اور اس طرح بنایا گیا تھا کہ سامنے سے چار جدا جدا محل نظر آتے تھے۔ تاریخ قطب شاہی میں اس محل کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

فضائے قصر ہایش گنج آمال ۔۔۔ صفائے صفحایش صبح اقبال

داد محل کے سامنے جو تالاب نما حوض بنایا گیا تھا اس کی تعریف میں اُس زمانے کے سیاح اور مورخین خاص طور پر رطب اللسان ہیں۔ چنانچہ فرِونی استر آبادی اُسی زمانہ میں حیدرآباد آیا تھا اور وہ اپنی تاریخ فتوحات عادل شاہی میں نور سپور کی تعریف کے سلسلہ میں دوسرے شہروں

کی عجائبات کا بھی تذکرہ کرتا ہے اور حیدر آباد کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ :-

"دریاچہ کہ در برابر داد محل قرار دادہ اند' بنوعے کہ فیلے از طلا ساختہ اند' چنانچہ آب از خرطوم فیل مثل فوارۂ لاینقطع در دریاچہ می ریزد کہ بر ہوا ساختہ اند' نوعے کہ طاقہا زدہ اند کہ حوضے بدیں بزرگی را کہ زیر او خالی ست و محل مرور مردم است پرداختہ اند۔ در آں عمارات و مواضع' اعجوبہ کاراں را وقتِ بسیار بکار رفتہ۔" (نسخہ برٹش میوزیم ورق ۲۱۷)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حوض سطح زمین سے کافی بلندی پر بنایا گیا تھا اور اس کے نیچے بلند کمانیں بنا دی گئی تھیں جن میں سے لوگ گزرتے تھے۔ گویا اپنی قسم کا نادر حوض تھا۔ یہ محل زوال سلطنت تک باقی تھا اور مغلوں کے قبضہ کے بعد توڑ دیا گیا۔ چنانچہ لچھمی نارائن شفیق نے اپنی کتاب احوال حیدر آباد میں (جو ۱۲۱۴ھ کی تالیف ہے) جہاں اس روایت کو نقل کر دیا ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب کی نظر جب داد محل پر پڑی تو اس کی زبان سے نکلا :-

"ایں بلند بلند چیست"؟

نعمت خانِ عالی نے عرض کیا :- "داد محل است"

اورنگ زیب نے کہا :- "آرے شدادمحل است"

داد محل کے توڑنے کا بھی واقعہ ان الفاظ میں درج کیا ہے :-

"ہرگاہ داد محل را شکستند' در عرصۂ سی سال بشکست رسید......

اکثر عمارات عمدۂ شہر تباہ شد و ہنوز تہ خانہ ہائے آن بعضے جا قائم۔"

دوسرے محلات

محمد قلی قطب شاہ کے بنائے ہوئے جن محلوں کا اب تک ذکر کیا گیا وہ سرکاری محل تھے۔ لیکن اس نے کئی ایسے محل بھی بنائے تھے جو

خود اس کی خانگی ضرورتوں اور ذوق کی تکمیل کی خاطر وجود میں آئے تھے۔ انہی میں "ندی محل" بھی شامل تھا جو موسیٰ ندی کے کنارے پانی کا نظارہ کرنے اور خانگی تفریح کی خاطر بنایا گیا تھا۔

افسوس ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے طویل قصیدے، مثنویاں اور ترجیع بند دستیاب نہ ہو سکے ورنہ اس موضوع کے تحت ہم اور کچھ لکھ سکتے۔ کیونکہ اس نے اپنے محلوں، باغوں اور دیگر عمارتوں پر تفصیل سے قصیدے اور مثنویاں لکھی ہیں۔ اس وقت اس کے کلام سے جو مواد ہمیں مل سکا ہے وہ صرف چھ سات محلوں (یعنی خداداد محل، سجن محل، حیدر محل، اعلیٰ محل، محل کوہ طور، قطب مندر اور رخا محل) اور ایک باغ محمد شاہی کی تعمیر و آرایش سے متعلق ہے لیکن ان میں بھی صرف تین کے متعلق اس نے تفصیل سے لکھا ہے اور باقی کی نسبت بہت ہی کم لکھا ہے۔ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سجن محل، اعلیٰ محل، حیدر محل، رخا محل اور قطب مندر پانچوں اس کی رہائش گاہیں تھیں۔ اور غالباً ان میں سے اکثر (سوائے قطب مندر کے) ایک ایک بیگم کے لئے مخصوص تھیں۔ البتہ قطب مندر ایک ایسا مقام تھا جہاں خود بادشاہ رہتا تھا اور جہاں بڑی بڑی محفلیں اور تقریبیں انجام پاتی تھیں۔ لیکن یہ محفلیں اور بزم آرائیاں بھی زنانہ ہوا کرتی تھیں۔ مردوں کی محفلوں اور دربار آرائی کے لئے جو مقام مقرر تھے وہ دوسرے ہی تھے جن کا ذکر گذر چکا ہے۔

خُداداَد محل

یہ حیدر آباد کا سب سے بڑا اور عظیم الشان آٹھ منزلہ محل تھا۔ اس محل کے بارے میں مورخین لکھتے ہیں :۔ (طوالت کے خوف سے صرف جگہ جگہ سے اقتباسات درج ہیں)

معمارانِ نادرہ کار متصل بہ عمارت "داد محل" طرح منزل عالی افگندہ درانک زمانے سقف عالیش از ایوان کیوان گذرانیدہ بذروۂ لامکاں رسانیدند از زیر تا بالا ہفت طبقہ .... مشتمل بر قصر ہائے مقرنس و غرفہ ہائے عالی حسن زینت پذیرفت مجموع ایں طبقات بہ "خدا داد محل" موسوم گردید ...... ہریک ازیں طبقات را بہ ایں وجہ موسوم ساختند طبقہ ہفتم کہ پہلو از عرش می زد بخطاب الٰہی محل مشرف گردید۔ طبقۂ ششم بہ لقبِ محمدی محل ...... طبقہ پنجم بہ حیدر محل ...... طبقات چہارم و سیوم ...... یعنے حسنی محل و حسینی محل ..... طبقہ دوم جعفری محل و طبقہ اول موسوی محل نامزد شد۔ چوں ایں قصر عالی اتمام یافت شاہ کامگار بادلِ شاد جشنِ شاہانہ آراستہ ارکان دولت و خاص و عامِ سلطنت را از احسان و انعام سرفراز گردانید۔ دراں مجلس میرک معین سبزواری حاجبِ نظام شاہ کہ در سخنوری دست رسا داشت تاریخ تازہ بعرضی رسانیدہ صلۂ گراں مایہ یافت۔ رباعی تاریخ ؎

ایں قصر کہ ہست رشک فرمائے بہشت　　　ایام آبِ زندگانیش سرشت

تاریخ مرتب شد نقش کلک قضا | بر لوحِ بقا بنائے جاں بخش نوشت

(تاریخ ظفرہ ص۱۶)

مشہور قطب شاہی تاریخ حدیقۃ السلاطین میں لکھا ہے کہ:-

" قصرہائے الہٰی محل و محمدی محل و حیدری محل و توابع و لواحق آں کہ بہ ہفت طبقہ خاقان جنت مکان سلطان محمد قلی قطب شاہ ساختہ بودند، و چند لک ہون خرچ آں شدہ بود و مثل آں قصرہا بر روئے زمین بنانہ شدہ۔" (مطبوعہ ص۲۲)

اس عجیب و غریب محل کے متعلق خود اس کے بانی نے جو لکھا ہے اُس سے زیادہ معتبر و مستند کسی مورخ کا بیان نہیں ہو سکتا چنانچہ کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ میں جو نظم خداداد محل کے متعلق موجود ہے اُس میں قطب شاہ لکھتا ہے کہ:-

" محمد نے خداداد محل کو سنوارا اور اسمیں جنت سے حسینوں کو لا کر رکھا تا کہ محل کی آرائش ہو۔ اس محل کی بلندی آسمان جیسی ہے جس کی وجہ سے عروج، چاند اور تاروں کی رونق بڑھ گئی ہے۔ روئے زمین پر ایسا محل کسی نے نہ دیکھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس کو بھی قدسیوں نے زمین پر لا کر رکھ دیا ہے۔ اس کی آٹھ منزلیں آٹھوں بہشتوں کی طرح ہیں جن میں آبِ حیات کے چشمے بہتے رہتے ہیں۔ یہ محل اتنا ہوادار ہے کہ اس کی آٹھوں منزلوں میں دمِ عیسیٰ جیسی ہوائیں چلتی رہتی ہیں تا کہ دنیا کو زندگی بخشیں۔ اس محل میں جو نازنینیں رہتی ہیں ان کے رخسار لعل بدخشاں کی برابری کرتے ہیں اور وہ سورج اور چاند جیسے پیالوں میں آبِ حیات بھر کر پلاتی ہیں۔ ان کے چہرے یمن ہیں تو ان کے ہونٹ عقیقِ یمن۔ اور ان کا مکھڑا سہیلِ یمن کی طرح روشنی پھیلاتا ہے۔

یہ ساری خوبرویاں جنت کی حوریں ہیں کیونکہ ہوا سے زیادہ نازک اور پانی سے زیادہ تپلی (لطیف) ہیں۔

جب یہ نغمہ زن ہوتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے زہرہ زمین پر گانے بجانے کے لئے اتر آئی ہے۔ جب یہ نازنینیں ہاتھوں اور آنکھوں سے ارت دکھاتی ہیں تو فرشتے ان کا نظارہ کرنے کے لئے آسمان کی کھڑکیاں کھول کر جھانکنے لگتے ہیں۔

یہ چھبیلیاں آسمانی[1] ڈوپٹے یا ساڑیاں باندھتی ہیں جن کے کنارے سورج کی کرنوں کی طرح جھلمل کرتے رہتے ہیں۔ ان کی بھویں آسمانی کمان کا کام کر کے رقیبوں کے دلوں کو ہدف بنا کر گھائل کرتی ہیں۔

اے قطب شاہ نبیؐ کے صدقے میں اور بارہ اماموں کے کرم سے تم اس محل میں اپنی بارہ پیاریوں کے ساتھ ہمیشہ عیش کرتے رہو۔"

اس نظم سے ایک چیز نئی یہ معلوم ہوتی ہے کہ خداداد محل آٹھ منزلہ تھا نہ کہ سات منزلہ جیسا کہ تاریخوں میں لکھا ہے۔ البتہ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آٹھویں محل کا نام کیا تھا؟ ایک چیز اور قابل ذکر ہے وہ ہر ایک منزل کا نہایت ہوادار اور کافی بلند ہونا۔ اس خصوصیت پر محمد قلی نے بہت زور دیا ہے اور تاریخیں ساکت ہیں۔ اس محل کے نقش و نگار اور زیبائش و آرائش کی توصیف میں مولف تاریخ قطب شاہی نے یہ شعر لکھے ہیں ؎

پر از نقش و نگار از فرش تا سقف	مہندس را برو فکر و نظر وقف
زعالی حرف ہائش چشم بد دور	مقوس طاق ہا چوں ابروئے حور

---

[1] آسمانی رنگ قطب شاہوں کا شاہی رنگ تھا اور محمد قلی اپنے کلام میں اس کا خاص طور پر کئی جگہ ذکر کرتا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ محل محمد قلی کے جانشین سلطان محمد کے عہد میں عین اُس روز جل گیا جب کہ سلطان محمد کے یہاں اس کی دوسری بیوی (جو ابراہیم عادل شاہ کی دختر تھی) کے بطن سے شاہزادہ ابراہیم مرزا پیدا ہوا تھا۔ اس کے متعلق مورخ لکھتا ہے کہ:۔

"شعلہائے آں بفلک اثیر رسید و مدت چند روز کہ می سوخت احدے را میسر نبو د کہ ہزار قدم و دو ہزار قدم راہ بجوالی آں گذار نماید و ایں قضیہ از قضایائے عجیبۂ غریبۂ روزگار بود۔" (حدیقۃ السلاطین ص۲۲)

خدا داد محل کے ساتھ نہ معلوم فنونِ لطیفہ کے کیا کیا خزانے جل گئے کیونکہ اس کی ہر منزل بجائے خود کسی نہ کسی آرٹ کی نمائش گاہ تھی۔ ایک میں کتب خانہ تھا، ایک میں مصوروں اور نقاشوں کے کمالات جمع تھے، اور ایک میں جلد سازوں اور کاغذ کو صاف اور مزین کرنے والوں کی نشست تھی۔ یہی وجہ ہے کہ محمد قلی کے عہد اور اُس سے قبل کی اردو کتابیں بھی ہمیں دستیاب نہیں ہو رہی ہیں۔ بعد کو اس نقصان عظیم کی تلافی کرنے کی کوشش کی گئی چنانچہ اس محل کی جگہ پر سلطان محمد نے بجائے ہشت منزلہ عمارت کے صرف چہار منزلہ عمارت بنا دی۔ لیکن یہ قصر بھی زوال گولکنڈہ کے بعد تباہ و تاراج ہو گیا۔ اور آج خدا داد محل کا نام و نشان بھی حیدرآباد میں باقی نہیں۔

البتہ اس کی ایک کمان جو بڑے بڑے پتھروں میں ترشی ہوئی ہے موجودہ محلہ چیلہ پورہ کی گلیوں میں موجود ہے اور اس کے اطراف سفالی مکان آباد ہیں۔

خداداد محل کا محل وقوع اسی کمان سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی محل کے نیچے سے ایک زمین دوز راستہ قلعہ گولکنڈہ تک جاتا تھا جس کے آثار اب تک موجود ہیں۔ موجودہ مسجد چوک کے قریب یہ سرنگ بھنوارہ کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ اور چند سال قبل اس کی صفائی اور کھدائی بھی عمل میں آئی تھی۔

محلِ کوہِ طور

یہ بھی حیدرآباد کے عظیم الشان محلوں میں سے تھا اور اس جگہ بنایا گیا تھا جہاں اب **قصرِ فلک نما** واقع ہے جو جدید حیدرآباد کا سب سے بہتر محل سمجھا جاتا ہے۔ محلِ کوہِ طور سہ منزلہ تھا۔ اس محل کے متعلق تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ:۔

در جانبِ جنوب کوہے مانند کوہِ طور پر فیض و سرور بود، خسرو زماں فرمود کہ برآں کوہ والا شکوہ عمارتے شاہانہ ترتیب دادہ اطراف وجوانب آں انہار و آبشار حوض ہائے فوارہ دار و اسمار بے شمار تیار سازند۔ ہنرمندانِ ماہر بموجب اشارہ بیمن اہتمام شہریار جہاں باتمام رسانیدند۔ نشیمنِ کوہ بریں وگلگشتِ آں سرزمین بفرِ قدوم وجلوسِ خسرو نو آئین بغایت مطبوع و شیریں می نمود۔ اکثر مجالس شربِ مدام مدام درآں مکان می بود" (تاریخ ظفرہ ص۱)

اس محل کے متعلق سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد کی تاریخ حدیقۃ السلاطین میں ذرا تفصیل سے لکھا ہے کہ:۔

جانبِ جنوب متصل بدروازۂ دارالسلطنت کوہے واقع ست کہ پنداری خلقت اورا از روز ازل باجزائے عشرت وسرور نمودہ اند۔ واحجار وطینِ اور از زلال خرمی وشادی مخمر ومنجمر ساختہ اند، ہموارہ فیوضات نامتناہی از مہبطِ انوار الٰہی برفرازآں کوہ نازل، وغایت فرح ونہایت شادمانی از سیرِ آں نزہت گاہ خاقانِ جہاں را حاصل، وسلطانِ علیین بارگاہ محمد قلی

قطب شاہ طاب ثراہ بربالائے آں کوہ عمارت وقصرے بغایت رفیع ،
مشتمل برسہ طبقہ وایوانہائے وسیع، وشاہ نشینہا، وغرفہا بہ تکلفاتِ گوناگوں
وتصرفات موزوں ساختہ اند۔ وپیش آں قصر فلک منظر طاقہائے بلند ساختہ
فضائے وسیع محاذی آں از آہک وسنگ ترتیب دادہ اند وبر زیر آں حوضے
بطول پنجاہ گز وعرض سی گز بستہ اند ودر اندرون آں قصر وایوان وشاہ
نشینہا حوض ہا ساختہ بجرہائے ثقیل آب را از نشیب آں کوہ بفراز بردہ جمیع
حوض ہا را از آب مملو ساختہ فوارہائے بلند را از آں زلال کوثر مثال جوشندہ
وچوں ابر مطیر در فضائے ہوا وسطح آب بارندہ گردانیدہ اند ودر دامنۂ کوہ فلک
شکوہ مشابہ بروج عماراتِ دیگر کہ تجملاتِ سلطنت واثاثۂ پادشاہی دراں گنجد
جا بجا بنا نمودہ اند وآں جبل پر صفا ونور را مسمّٰی بہ کوہِ طور گردانیدہ اند۔" (۵۷ ص)

مطلب یہ کہ کوہ طور بہت پر فضا جگہ تھی۔ وہاں کی سرسبزی وشادابی کو دیکھکر محمد قلی قطب شاہ نے وہاں ایک سہ منزلہ محل بنوایا جس کے ایوان وسیع، اور شاہ نشین اور کمرے نہایت پر تکلف تھے۔ اس محل کے سامنے اونچی اونچی کمانیں بناکر سامنے کے صحن کو پتھر اور چونے سے ترتیب دیا۔ اس کے نیچے ایک بہت بڑا حوض ۱۵۰ فیٹ لانبا اور ۹۰ فیٹ چوڑا بنایا گیا۔ اس محل میں اور اس کے جملہ ایوانوں اور شاہ نشینوں میں ہر جگہ حوض اور فوارے بنائے گئے۔ اور نیچے سے پانی اوپر اس طرح پہنچایا گیا کہ تمام فوارے بادل کی طرح فضا میں پانی برساتے رہتے تھے۔ پہاڑ کے دامن میں بھی برجوں کی طرح عمارتیں بنائی گئیں تاکہ دوسری شاہی ضرورتوں کے کام آئیں۔

تاریخ محمد قطب شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس محل کے شاہ نشین کا طول ۹۰ فیٹ اور عرض ۶۰ فیٹ تھا۔ اور اس کا حوض ۱۳۵ فیٹ لانبا اور ۹۰ فیٹ چوڑا تھا اور اس کی عمارت میں چار ایوان تھے۔ (نسخہ نواب سالار جنگ بہادر صفحہ ۲۶۹)

محمد قلی قطب شاہ نے جو نظم "محل کوہ طور" لکھی ہے اس میں اُس نے حسب ذیل باتیں بیان کی ہیں :۔

چونکہ کوہ طور پر ہمیشہ خدائے تعالیٰ کی تجلی نظر آتی ہے اسلیئے خلقِ خدا اس کو دیکھنے آتی ہے اور اس کی روشنی سرمہ بن کر لوگوں کی آنکھوں کو روشن کرتی ہے۔

اس طور کا منظر بہشت کے مانند ہے۔ آسمان کی روشنی اس کے نور کے تلے چھپ جاتی ہے۔

اس محل کو دیکھ کر سب لوگ اپنی بھوک پیاس بھول جاتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر شاہ مرداں کی تجلی جھلک رہی ہے۔

اس کے بارہ برجوں پر بارہ اماموں کی نظر عنایت ہے اسی وجہ سے اس محل پر ایمان کی روشنی چمکتی رہتی ہے۔

اس محل کا ہر ایک کنگورا اتنا بلند ہے کہ اس پر چڑھنے سے اسطرح تمام عالم نظر آتا ہے جس طرح جام جہاں نما سے نظر آتا تھا۔ اس کے ہر منارے پر شاہِ کنعاں کا حسن جھلکتا رہتا ہے۔

یہ محل اپنی بلندی اور روشنی کی وجہ سے ساتویں آسمان کا قطب تارا معلوم ہوتا ہے۔ اور تختِ سلیمان اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے جو فرامین نکلتے ہیں وہ اجالے کی طرح تمام عالم میں جاری ہو جاتے ہیں۔

اس محل کا صحن آئینۂ سکندر ہے جس میں ایران و توران کی روشنی بھی منعکس نظر آتی ہے۔

اس محل کے اطراف جو میدان ہے وہ اتنا نورانی اور بارونق ہے کہ

اس کے مقابلہ میں چاند اور سورج بھی خود کو بے رونق سمجھ کر اس کو دیکھنے کے
لئے روزآنہ بیتاب ہو کر آتے ہیں۔

ساتوں اقلیموں میں اس محل کی نظیر نہیں۔ اس کی روشنی
کے آگے سورج کا اجالا تارے کی روشنی نظر آتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت سے چاند اور سورج کو لیکر اس
محل کی بنیاد میں رکھ دیا گیا ہے اسی لئے یہ روشنی کی ایک کان نظر آتا ہے جسکی
روشنی جواہرات کی تمام کانوں میں بھی جھلکتی رہتی ہے۔

اس محل کے کنگورے اتنے بلند ہیں کہ عرش کے قدم سے جالگے
ہیں، اسی لئے اس جگہ کا اجالا تمام دنیا کے لئے قبلہ گاہ بن گیا ہے۔

اس محل کے ہر شہ نشین میں اور ہر برج پر بادشاہ کے حکم سے
ہر روز مہ جبینوں کی مجلس آرائیوں کی وجہ سے روشنی چمکتی رہتی ہے۔

اے قطب شاہ نبیؐ کے صدقے میں تو اس محل میں آرام و اطمینان
سے زندگی بسر کر کیونکہ اس میں شیرِ یزداںؑ کی تجلی بھی جھلکتی رہتی ہے۔

اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ محل کوہِ طور اصل میں ایک شبستاں کا کام دیتا تھا۔ جہاں بادشاہ اپنی پیاریوں کو لے کر اپنی زندگی عیش و نشاط کے ساتھ بسر کرنے جاتا تھا۔ ایسی اچھی تفریح کا مقام شاید پوری سلطنت میں کوئی نہ تھا۔ کیونکہ وہاں سے نہ صرف شہر حیدرآباد اور گولکنڈہ کی آبادی نظر آتی تھی بلکہ اطراف و اکناف کے باغوں اور محلوں کی اور رات کے وقت پورے پایۂ تخت کی روشنی پیش نظر ہو جاتی تھی۔ اس مقام کی ان خصوصیتوں کی طرف قطب شاہی مورخ نظام الدین احمد نے بھی خاص طور پر توجہ کی ہے اور اس کی حسبِ ذیل فارسی عبارت محمدؐ قلی قطب شاہ کی اردو نظم کا بعینہٖ ترجمہ ہے۔ کیا تعجب ہے کہ یہ عبارت لکھتے وقت مورخ کے پیش نظر بانیٔ محل کی اصل نظم بھی ہو!

مورخ لکھتا ہے :-

" بربالائے آں کوہ وعمارتِ فلک شکوہ، برآمدہ جہاں بین وخرم سواد عمارات وخضرتِ بساتین وباغات چند آنکہ حس بصر شاہدہ نماید از اطراف بنظر در آوردہ از غایتِ فرح ونشاطِ عیش وعشرتِ انبساط فرمودند۔ وماہرویانِ زہرہ جبیں وشاہدانِ حورالعین بہ اطراف اورنگ شہر یارِ خسرو آئیں حلقہ زدہ بخدمت قیام نمودند۔ وصراحی ہائے راح ارغوانی چوں آفتاب نورانی بر فراز آں کوہ تجلی نمود۔ وجامہا چوں بدرِ منیر از آب آتش انگیز لبریز شد۔ صلائے نوشا نوش بہ محبوبان بادہ نوش در دادند " (ص ۵۸)

یہ محل اور اس کے باغ کی سرسبزی وشادابی سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں بھی اسی طرح بہار پر تھی اور وہ اسی طرح استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ سلطان عبداللہ نے ۱۰۳۷ھ کے موسم برسات میں وہاں ایک مہینہ تک قیام کیا اور اپنے نانا محمد قلی کی سنت کو (بقول حدیقۃ السلاطین "در آں عشرت سرا روز وشب بہ عیش وعشرت وطرب اشتغال نمودند") پورا کیا۔

قطب شاہی سلطنت کے خاتمہ کے بعد یہ محل بھی ختم ہوگیا اور اسی کے کھنڈروں پر بعد کو **قصرِ فلک نما** بنایا گیا۔ نواب شمس الامراء کا **قصر جہاں نما** بھی محلِ کوہ طور ہی کے احاطہ میں تھا۔ اور امراکی فرودگاہ کے کام آتا تھا۔ ان ہی کھنڈروں پر جہاں نما آباد ہوا ہے۔

باغ محمد شاہی

باغ محمد شاہی کا محل وقوع تاریخوں سے اس جگہ معلوم ہوتا ہے جہاں اب میر عالم کی بارہ دری، نئے پل کا دروازہ، یوسف گنج اور چھتہ بازار واقع ہے۔ یعنی دلی دروازہ کے جانب مغرب تو ملک امین الملک کا باغ تھا اور جانب مشرق باغ محمد شاہی۔ یہ باغ ندی سے لیکر بلدیہ اور دارالشفا کی عمارت، پرانی حویلی اور دیوان ڈیوڑھی تک پھیلا ہوا تھا معلوم ہوتا ہے کہ دارالشفائے شاہی اور ندی کے درمیان کوئی عمارت نہ تھی بلکہ باغ ہی باغ تھا کہ مریضوں کو کھلی اور صاف ہوا ملے۔ اس باغ میں ایک طرف کو ایک محل بھی بنایا گیا تھا۔ یہ محل غالباً اُسی جگہ واقع ہوگا جہاں اب نواب میر عالم کی مشہور و معروف بارہ دری کھڑی ہے۔ جس کو آج کل لکڑ کوٹ بھی کہا جاتا ہے۔

کلیات محمد قلی میں **باغ محمد شاہی** سے متعلق ایک نظم ملتی ہے جس کے مطالعہ سے اس زمانہ کے باغوں، درختوں، پھلوں، اور پھولوں کے متعلق دلچسپ علم حاصل ہوتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کا ذوق اتنا پختہ تھا کہ اس نے کشادہ بازاروں، نفیس حماموں اور عالیشان محلوں کے ساتھ حیدرآباد کے شایان شان باغ بھی تعمیر کیے تھے۔ اس کی اس نظم سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ اس زمانہ میں باغوں کے اطراف چار دیواری ہوتی تھی جو زیادہ بلند نہ ہوتی۔ کیونکہ اس پر سے تمام درخت اور ان کے پھل اور پھول نظر آتے تھے۔ چار دیواری کے ساتھ ساتھ سڑک بنائی جاتی جہاں سے باغ کے مناظر دکھائی دیتے تھے، اور جس پر اس کے پھولوں کی خوشبو مہکتی رہتی۔ پھولوں میں اس نے چنپا کلی کا خاص کر ذکر کیا ہے۔ اور پھلوں میں انگور، انار، کھجور، پپیاری، ناریل، جامن، اور محمد پھل کا۔ محمد پھل سے مراد غالباً بادام ہے کیونکہ اس سے



دارالشفا ۔ حیدرآباد کا پہلا دواخانہ

آنکھوں کو تشبیہہ دی ہے۔ تعجب ہے کہ محمد قلی نے آم اور جام (امرود) کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آم ہی کو محمد پھل کہا ہو۔ انگور اور کھجور عہد حاضر کے حیدرآبادی باغوں میں کم نظر آتے ہیں۔

اس باغ کے متعلق تاریخ ظفرہ میں لکھا ہے :—

"باغ وبستان در اطراف آں قصر ہویداست۔ رشک افزائے خلد بریں ومیوہ ہایش چوں عناقد پروین۔

مثنوی

خاکش از نیکوئی عبیر سرشت	میوہ ہائش چوں میوہ ہائے بہشت
تاک انگور کج نہادہ کلاہ	دیدہ در حکم خود سفید و سیاہ
شاخ نارنج و برگ تازہ ترنج	نخلبندے کشادہ بر سر گنج

شاہ جم جاہ اکثر اوقات دریں باغ فردوس صفات باپری چہرگانِ دل ربا و اسیرانِ ماہ لقا نہالِ طرب در چمن لہو و لعب نشاندہ جرعۂ شادکامی بر عالمِ فانی می افشاند۔"

محمد قلی نے باغ محمد شاہی پر جو نظم لکھی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

"محمد قلی کا یہ تمام چمن محمدؐ کے نام سے سرسبز و شاداب ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے اپنے طوبیٰ جیسے درختوں کی وجہ سے یہ چمن جنت کی طرح سہانا معلوم ہوتا ہے۔

جس طرح فانوس کے اندر سے چراغوں کی روشنی خوبصورت نظر آتی ہے اسی طرح دیواروں کے پیچھے سے میووں اور پھولوں کے جسم نظر آ رہے ہیں۔

پھول کھلانے کے لیئے اس چمن کی ہوا دم عیسیٰ کا کام کرتی ہے اور سرسبز نہالوں کی خبر مشاطہ کی طرح لوگوں تک پہنچاتی ہے تاکہ لوگ آ کر ان کی بہار دیکھیں۔

سڑک سے جب میں باغ کو دیکھتا ہوں تو خوشی سے میرے دل
کی کلی کھل جاتی ہے اور اس کی خوشبو سے دنیا مہکنے لگتی ہے۔
چمن میں پھولوں کو کھلتا ہوا دیکھ کر سکھیوں کا منہ یاد آتا ہے
اور مچھل پھل کی طرح ان کی آنکھیں زیب دیتی ہیں۔
چنپا کی کلی ناک کی طرح نظر آرہی تھی جس کی دو پتیاں دو پہلوؤں
کی طرح ہیں اور اس جگہ بھنورے کو تل کی طرح دیکھ کر سب کا دل حیران ہو گیا۔
لاکھوں انگوروں کے خوشے ثریا اور سنبلہ کی طرح دکھائی دیتے
ہیں اور اس انگور کے منڈوے کی تازگی کے سامنے آسمان پرانا نظر آتا ہے۔
اناروں میں دانے ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں جیسے یاقوت پتلیوں
میں۔ اور کھجوروں کے خوشے مرجان کے پنجوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ اور
سپیاری کے لال خوشے دن اور رات کی طرح سیاہ و سفید نظر آتے ہیں۔
ناریل کے پھل زمرد کے مرتبانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں اور
اس کے تاج کو اہل دکن پیالہ کہتے ہیں۔
جامن کے پھل باغ میں سالم نیلم کی طرح نظر آتے ہیں اور اس کو
اس لئے رکھا ہے کہ دوسرے میووں کو نظر نہ لگے۔
اس باغ کی تعریف و توصیف کے لئے سوسن نے بھی دس
زبانیں کھولی ہیں اور دکن اپنی سب سندریوں اور حسینوں کی وجہ سے
کھلی ہوئی نرگس کی طرح بارونق ہو گیا ہے۔
چمن کا شہرہ سن کر بلبل سب آپس میں خوشی سے الاپ
رہے ہیں اور ان کی آواز سن کر جنت کی حوریں رقص کر رہی ہیں۔ جس کو

دیکھ کر درخت مست ہو رہے ہیں اور اپنے پتوں جیسے ہاتھوں سے تالیاں
بجا رہے ہیں۔ ڈالیاں پھولوں کی شراب جیسی خوشبو سے مست ہو کر ڈول
رہی ہیں۔ شاید یہ شبنم کی شراب ہے یا کسی کے ہونٹوں کے عرق کا پیالہ۔
یہ بھی اچھا ہے اور وہ بھی اچھی بشرطیکہ اے محبوب تیرے ساتھ مل کر پینے
کا موقع ملے۔"

یہ باغ چند ہی سال کے عرصہ میں اتنا سرسبز و شاداب ہو گیا تھا کہ بعد کو جو سیاح حیدرآباد آئے انھوں نے اس کی بڑی تعریف کی۔ محمدؐ قلی کے جانشین سلطان محمدؐ قطب شاہ کے مورخ نے اس باغ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

نشاط بخش مقامے کہ عاشقاں در وے — تمام عمر تو انند زیست بے دلدار
شفا بہ بخشد اگر نامش آوری بہ زباں — بجائے فاتحہ اندر عیادتِ بیمار

ندی محل اور حیدرآباد کی نہریں

سلطان محمدؐ قلی قطب شاہ کو سرسبزی و شادابی سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ برسات اور پانی کا دیوانہ تھا۔ جہاں جہاں پانی مل سکتا تھا وہاں اس نے محل، باغ، اور عمارتیں بنادیں اور جہاں پانی نہیں پہنچ سکتا تھا وہاں تک پانی لانے کی جر ثقیل وغیرہ کے ذریعہ سے ایسی ایسی ترکیبیں کیں کہ آج عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ ایسے قدیم زمانے میں یہ کیونکر ممکن تھا۔

چارمینار اور کوہ طور جیسی بلندیوں پر حوض بنا کر ان میں پانی پہنچانے کا تذکرہ گزرچکا ہے۔ اس کے علاوہ داد محل، دولت خانۂ عالی اور محلِ کوہِ طور کے عجیب و غریب حوضوں اور فواروں کے احوال بھی درج ہو چکے ہیں۔ شاہی محلات کے علاوہ محمدؐ قلی نے عوام کے لئے بھی بازاروں میں پانی کی نہریں دوڑادی تھیں اور یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ شاہجہان آباد اور نہر چاندنی چوک کی تعمیر میں ابھی نصف صدی سے زیادہ زمانہ باقی تھا۔

حیدرآباد کے اکثر بازاروں میں دونوں طرف پانی کی نہریں بہتی رہتی تھیں[۱] اور ان کے کنارے سایہ دار درخت لگائے گئے تھے۔ ایک مغربی سیاح ولیم میتھولڈ لکھتا ہے کہ :-

"شہر حیدرآباد اپنی خوشگوار آب و ہوا اور پانی کی بہتات کی بدولت ہندوستان کا بہترین شہر ہے۔" (گولکنڈے کے تعلقات ص۹)

---

[۱] حدیقۃ العالم مقالہ اول صفحہ ۲۱۵ مطبوعہ مطبع سیدی حیدرآباد دکن۔

عہد اورنگ زیب کے مورّخ خافی خاں نے لکھا ہے کہ:۔

"حوضہائے آں شہر، لطافت و آب و ہوائے آں سرزمین، و حسن ہائے نمکینِ آں سبز فام، و سیر حاصلی آں مرز و بوم، اگر پرو ازم از سر رشتۂ سخن باز می مانم۔" (منتخب اللباب جلد دوم ص ۳۶۴)

اسی طرح شہنشاہ اورنگ زیب کے خاص مورخ محمد ساقی نے بھی جو فتح گولکنڈہ کے وقت ہمرکاب تھا حیدرآباد کی اس خصوصیت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"رطوبت ہوا، وعذوبت روانی چشمہا، شادابی سبزہ، بہ مرتبہ کہ پنداری گل و سبزۂ ایں سرزمین را آب و رنگِ زمرد و لعل است۔" (ماثر عالمگیری ص ۳۲)

اگرچہ محمد قلی کے بنائے ہوئے محل آج حیدرآباد میں باقی نہیں ہیں لیکن جو محل قلعہ گولکنڈہ میں اب تک شکستہ و بوسیدہ حالت میں موجود ہیں ان کے دیکھنے سے ثابت ہوجاتا ہے کہ چھ چھ سات سات منزلہ عمارتوں میں اوپر تک پانی پہنچانے کے انتظامات موجود تھے اور بعض محلوں کی چھتوں پر اب تک حوض موجود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام قطب شاہی سلاطین پانی کے بے حد دلدادہ تھے اور ان میں بھی محمد قلی کو تو خاص طور پر دلچسپی تھی۔

ندی محل

بہتے ہوئے پانی سے لُطف اٹھانے اور اجلاس عام کے لئے اُس نے موسیٰ ندی کے کنارے ایک ندی محل تعمیر کرایا تھا۔ اس کے سامنے ندی تک ایک میدان دلکشا تیار کیا گیا تھا اور عقب میں بھی شاہی ہمراہیوں اور امیروں کے ہاتھیوں، گھوڑوں، سواروں اور پیادوں کے ٹھہرنے اور بوقت ضرورت ان کے شمار کرنے کے لئے ایک وسیع صحن چھوڑا گیا۔ اس محل کی تعمیر کا حال تاریخ قطب شاہی میں شرح و بسط سے درج ہے۔ ذیل کا طویل فارسی بیان اس لئے یہاں نقل کیا جارہا ہے کہ اس تاریخ کے بہت کم نسخے دنیا میں موجود ہیں اور موجودہ حالات کے تحت خیال ہے کہ شاید ہی یہ کبھی طبع ہو؟

"میلِ ساختنِ عمارتِ عالی، بجہت مجلس و دیوان داری، از مشرق ضمیر انور، سرزوہ۔ معماران را بہ اتمام قصر رفیع، در کنارِ ندی کہ فضائے وسیع متصل بہ آں باشد، مامور گردانید۔ و بنّایان چابک دست، باندک روزے قصرے کہ نمونۂ بستانِ ارم، و چوں ساحتِ فردوس خرم بود، ساختہ غرفاتِ بلندش را، از ذروۂ مہر گذرانیدند۔ و بر عقبِ آں عمارت، میدانے کہ طول و عرضِ آں را، چوں فضائے امل پایانے پیدا نہ بود، ترتیب دادند۔ تا در روز نشان و گنجی جائے اسپ و فیل و پیادہ و سوار تواند بود۔

والحق تا ندی کہکشاں در مرغزارِ آسماں جاری ست۔ و تا ذکرِ چشمۂ حیواں بر زبان ہا ساری ست۔ بسان ندی محل، موضعے روح افزا، و منزلے خوش ہوائے دلکشا، قلم نقش بند وجود، بر تختۂ ہستی نہ نگاشتہ۔ و روزگار ستونِ عمارتے بدیں ارتفاع و زیبائی آں، بدو و ایجاد آب و خاک، تا اکنوں بر نیفراشتہ۔" (تاریخ محمد قطب شاہی نسخہ سالار جنگ ورق ۲۵۲ ل)

اسی مورّخ نے ندی محل کی تعریف میں ایک نظم بھی لکھی ہے جو یہ ہے اور جس کو مولف تاریخ ظفرہ نے بھی نقل کیا ہے۔

این مقامِ خوش کہ مستغنی ست از نقش و نگار
ہست با جنات تجری تحتہ الانہار یار

فرخ آں منزل کہ شاہے را بود در وے نشست
روشن آں محفل کہ ماہے را بود در وے گذار

بے قراراں را قرار دل فزاید چو در اں
جائے آں دارد کہ باشد نام او دارالقرار

چوں دلِ دانا درو پیدا ست صورت ہائے غیب
بس کہ مصقول ست دیوار و درش آئینہ دار

مامن عیش است چوں فردوس تا در وے کشد
نو عروس ملک در بر شاہ جمشید اقتدار

خسرو عالی گہر سلطان محمد قطب شاہ
شہریار کامیاب و کام بخش و کامگار

یا بداز عدلش درختِ میوۂ امید بر　　　بیند از جوشش نہال دولت جاوید باد

اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد قلی کے بعد سلطان محمد بھی اس محل میں مجلس آرائی کیا کرتا تھا۔ اور یہ محل غالباً اسی کے عہد میں مکمل ہوا۔ عہد محمد قلی کا یہ غالباً آخری محل تھا اور اس پر وہ کوئی نظم لکھنے نہ پایا تھا کہ فوت ہو گیا۔

یہ محل اسی جگہ بنایا گیا تھا جہاں اب عدالت العالیہ کی عمارت واقع ہے۔ اس کے سامنے موسٰی ندی بہتی تھی اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اسی محل کے میدان دلکشا میں علامہ محمد ابنِ خاتون پیشوائے سلطنت ہر منگل کو (جو قطب شاہی عہد میں عام ہفتہ واری تعطیل کا دن ہوتا تھا) حدیث و فقہ کا درس دیا کرتے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں حاضرین ان درسوں اور تقریروں سے مستفید ہوتے تھے۔

آصفجاہ سادس میر محبوب علی خاں غفراں مکاں کے عہد حکومت میں جب ہائیکورٹ کی تعمیر شروع ہوئی تو اسی محل کے کھنڈروں اور بنیادوں کو مٹا کر عدالت عالیہ کی موجودہ عالی شان عمارت تعمیر کی گئی ہے۔

حیدرآباد ہائی کورٹ کی یہ عمارت آصفجاہ سابع میر عثمان علی خاں کے عہد میں تکمیل کو پہنچی ہے اس لئے اس کے روکار پر عثمانیہ عدالت العالیہ کا کتبہ کندہ ہے اور اسی نام سے یہ عالی شان عمارت مشہور بھی ہے۔
یہ پوری عمارت عہد محمد قطب شاہ کی عمارتوں کی طرح مصفا سنگِ خارا یا گرانائٹ سے بنائی گئی ہے جگہ جگہ سرخ پتھروں سے کمانوں کے حاشیے یا نقش و نگار بنا کر اس کی خوبصورتی میں اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ دو منزلہ اور بہت بلند عمارت ہے اور دور دور سے نظر آتی ہے۔ اس کی تعمیر پر اکیس (۲۱) لاکھ اکیس ہزار روپے صرف ہوئے۔ اس کا درمیانی گنبد بہت عالی شان بیضاوی مخروطی شکل کا ہے اور عمارت کے ہر گوشے پر بھی اسی وضع کے متعدد گنبد اور برجیاں بنائی گئی ہیں۔ اپنی خوبصورتی اور دلکشی کے اعتبار سے یہ عمارت ہندستان کی بیسویں صدی کی عمارتوں میں بطور خاص قابلِ تعریف تصور کی جاتی ہے۔

نبات گھاٹ اور باغ دلکشا

محمد قلی قطب شاہ کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کو بھی تعمیر کا شوق اپنے چچا سے کم نہ تھا۔ یہ نوجوان محمد قلی کا بھتیجا اور اس کی اکلوتی شہزادی حیات بخشی بیگم کا شوہر تھا۔ اس نے قلعہ محمد نگر گولکنڈہ کے مقابلے میں شہر حیدرآباد کے مشرق کی طرف ایک عظیم الشان قلعہ سلطان نگر کی تعمیر شروع کی، مکہ مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا، اور اس کے علاوہ کئی محل مثلاً محلِ نبات گھاٹ، نبی باغ، حوض گوشہ محل، باغ دلکشا اور گگن محل وغیرہ تعمیر کرائے۔ وہ بہت جلد عنفوانِ شباب میں انتقال کر گیا۔ اگر اس کو کچھ اور موقع ملتا تو شہر حیدرآباد کی رونق اور زیبایش میں مزید اضافہ ہوتا۔

موجودہ قصرِ ہل فورٹ نوبت پہاڑ کے مقام پر اس نے جو قصرِ نبات گھاٹ تعمیر کرایا تھا، اس کی تفصیل تاریخ محمد قطب شاہی میں موجود ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

ایک روز محمد قطب شاہ سیر و شکار کرتا ہوا حیدرآباد سے جانب شمال چلا جا رہا تھا کہ آفتاب سر پر آ پہنچا اور گرمی کی شدت محسوس ہونے لگی تو بادشاہ نے اپنے ساتھیوں کو کسی ٹھنڈے مقام کی تلاش میں روانہ کیا۔ ایک شخص نے واپس آ کر عرض کیا کہ اس پہاڑ کے قریب ایک اچھی جگہ اور دلکش مرغزار ہے جہاں ہر طرف آبِ زلال کے چشمے بہتے ہیں اور ہوا فرحت بخش ہے۔ بادشاہ اس طرف پہنچا اور دیکھا کہ واقعی ایک خوشنما پہاڑ اور دلکش وسیع میدان ہے جو نشیمن خلافت اور مسند عیش کے لائق ہے اس نے فوراً ارادہ کر لیا کہ قصر ہائے رفیع اور

ایوان ہائے وسیع تعمیر کیے جائیں۔ یہ پہاڑ مستقر سلطنت سے صرف دو کوس کے فاصلے پر ہے اور اس کے چاروں طرف بڑے بڑے حوض، نہریں اور تالاب (حسین ساگر) ہیں۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ ساعت شائستہ دیکھ کر اس پہاڑ پر قصر ہائے رفیع اور ایوان ہائے عالی بنائے جائیں۔ اور دامنِ کوہ سے دارالسلطنت حیدرآباد تک ایسے بڑے باغ بنائیں جو آٹھ میل طویل اور چار میل عریض ہوں۔ چنانچہ حکم عالی کے مطابق بہت جلد ایک قصر بن گیا جو ایوان کیواں سے بلند ہے۔ اس قصر کی تعریف میں مورخ نے شعر لکھے ہیں۔

از آں ایواں چہ گویم کز لطافت — جہاں را نسخۂ خلدِ برین است
خم طاق بلندش چوں مہ نو — ز رفعت با فلک پہلو نشین است

افسوس ہے کہ اس قصر کے کوئی آثار موجودہ نوبت پہاڑ پر اب موجود نہیں ہیں۔
اسی پہاڑ کے دامن میں غفراں مکاں آصف جاہ سادس کے عہد میں رفعت جنگ بشیر الدولہ آسماں جاہ عمدۃ الامراء نے قصرِ بشیر باغ تعمیر کیا اور اس کے ایک پہلو پر عہد آصفجاہ سابع میں سر نظامت جنگ نے قصرِ ہل فورٹ بنایا جو بعد کو آصفِ سابع کے دوسرے صاحبزادے شہزادہ معظم جاہ کی فرودگاہ قرار پایا۔

عجیب بات یہ ہے کہ سلطان محمدؒ نے جس طرح شہر حیدرآباد کے مشرق میں قلعہ سلطان نگر کی بنا ڈال کر قلعہ گولکنڈہ کا جواب تعمیر کرنا چاہا اسی طرح شہر کے جانب شمال نوبت پہاڑ پر قصرِ نبات تعمیر کر کے محمدؒ قلی کے محل کوہِ طور کا جواب تیار کر دیا تھا جو شہر کے جانبِ جنوب واقع تھا۔

باغ دلکشا	قصر نبات گھاٹ کی تعمیر جب مکمل ہو چکی تو اس کے دامن میں ایک باغ کی طرح ڈالی گئی۔ جس کے ہر ضلع میں ایک دروازہ عالی بنایا گیا۔ اور ہر دروازے

کے اوپر کوشک تعمیر کیے گئے۔ اس کی تعریف میں مورّخ لکھتا ہے:۔

"اطراف آں را بہ انواع اشجار و درختاں میوہ دار و گلہائے خوشبوے و ریاحین دلجوے، صنعت کمال بخشیدہ، جدولہائے آب کافی، در ہر طرف جاری گردانیدہ اند۔"

گلابست گوئی بجویش رواں | ہمی شاد گردد بہ بویش رواں

(تاریخ محمد قطب شاہی ورق ۲۵۳ ب)

اسی سلسلے میں مورّخ نے میووں، درختوں، اور پھولوں کی تازگی اور سرسبزی کی تفصیلات درج کی ہیں اور اپنے بیان کو اس باغ کے آموں کی تعریف میں یہ شعر لکھکر ختم کیا ہے ؎

صفت انبہ چہ گویم کہ بہ شیرینی و لطف | کوزۂ چند نبات است معلّق برباد

اسی باغ کی جگہ پر بعد کو **فتح میدان** اور **باغ عام** کی طرح ڈالی گئی اور اسطرح سلطان محمد قطب شاہ کی نظرِ انتخاب اب تک سیاحوں اور حیدرآباد کے جملہ باشندوں سے داد و تحسین حاصل کر رہی ہے۔

اس باغِ دلکشا کا سنگِ بنیاد ۱۰۲۴ھ میں رکھا گیا تھا اور اس کی خصوصیات اور تیاری کی تاریخ قطب شاہی مورخ نے اس قصیدے میں قلمبند کی ہے ؎

سرورِ ملکِ دکن سلطان محمد قطب شاہ | اے کہ دارد آرزوے خدمتت ہفت آسماں
تا نہادی پایہ تخت سلطنت راعز و ناز | سر بفرمانِ تو دارد خسروِ چارم مکاں
اے سریر تاج شاہی آمدہ در شان تو | چوں خلافت کز محمد یافت شاہِ انس و جاں
چونکہ قصر و باغِ دولت را بہ توفیق الٰہ | ساختی در وے صد و سی سال باشی کامراں
وہ چہ قصرے کز رہِ رفعت فلک بوسد درش | وہ چہ باغے کز لطافت ہست چوں باغ جناں
بلبل بزم نشاطش چوں در آید در نوا | در بہشت جاوداں جز خلد ننہد آشیاں

حبذا باغے کہ فیضش روح بخشی می کند　　مرحبا قصرے کہ پیشش گوش گیرد آسماں
سال تاریخ بنائش دل زپیر عقل جست　　گفت فردوس جہان و گلشن قطب زماں

اس قصیدے سے معلوم ہوتا ہے کہ باغ دلکشا میں ایک قصر بھی تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس کے موجودہ جانشین باغ عام میں بھی عہد آصفجاہ سابع میں قصرِ جوبلی اور عہدِ آصفجاہ سادس میں ٹاون ہال جیسی عظیم الشان عمارتیں تعمیر کی گئیں جو اس شہر کی زیب و زینت میں اب بھی اضافہ کا باعث ہیں۔

سلطان محمدؒ قطب شاہ کے ذوقِ تعمیر اور اس کی عمارتوں کی خصوصیات کے سلسلے میں ایک بات یہاں واضح کردینا ضروری ہے کہ اس کے عہد میں حیدرآباد میں جتنی عمارتیں اور مسجدیں اور گنبد تعمیر ہوئے وہ سب مصفیٰ اور تراشیدہ پتھروں سے بنائے گئے تھے۔ اور ان پر بیرونی طرف گچ کی استرکاری نہیں کی جاتی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ کی بنائی ہوئی عمارتیں چونے کی استرکاری اور نقش و نگار سے آراستہ ہوتی تھیں۔ اس کے برخلاف سلطان محمدؒ نے یہی کام پتھر کو صاف اور مصفیٰ کرکے اور اس پر نقش و نگار کندہ کرکے لیا تھا۔ سلطان محمدؒ کے بعد اس قسم کی عمارتیں صرف عہد آصفجاہ سابع میں بنوائی گئیں۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کا کلیۂ فنون (آرٹس کالج) اس عہد کی اسی طرح کی ایک تعمیری یادگار ہے جس طرح سلطان محمدؒ کی یادگار مکہ مسجد جس کی نسبت مشہور فرانسیسی سیاح ٹیورنیر نے لکھا تھا کہ:۔

"پچاس برس ہوئے جب سے یہاں ایک عظیم الشان مسجد بن رہی ہے اگر پوری ہوگئی تو یقیناً تمام ہندوستان کی مسجدوں سے بڑی اور تمام ایشیا کی عمارتوں سے بہتر ہوگی"

مگر افسوس ہے کہ یہ مسجد نہ سلطان محمدؒ کے عہد میں پوری ہوئی اور نہ قطب شاہی عہد میں۔ اورنگ زیب نے اس کو جوں توں ختم کرادیا۔ اگر یہ اپنے اصلی نقشے کے مطابق بنتی تو ٹیورنیر کی پیشین گوئی پوری ہوتی۔ اس مسجد کا مسقف حصہ ۲۲۵ فیٹ طویل، ۱۸۰ فیٹ عریض اور ۷۵ فیٹ بلند ہے۔ اس کی چھت پندرہ گنبدوں پر قائم ہے اور یہ گنبد اس خوبی سے بنائے گئے ہیں کہ نہ باہر سے نظر آتے ہیں اور نہ اندر سے اس کے وجود کا علم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ جن ستونوں پر قائم ہیں ان کو بڑی بڑی کمانوں یا محرابوں کی شکل دیدی گئی ہے۔

چار محل اور چو محلّہ

اہل حیدرآباد نے شاید کبھی اس واقعہ پر غور نہیں کیا کہ اس شہر کو (۴) کے ہندسے سے غیر معمولی دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ جہاں اس شہر کا آغاز ہی چار مینار سے ہوتا ہے اس کی تعمیر و تزئین کا پہلا دور بھی چار محل کی تعمیر پر ختم ہوجاتا ہے۔ یہ محل آخری قطب شاہی سلطان ابوالحسن تاناشاہ نے زوال سلطنت سے چار سال قبل ۱۰۹۴ھ میں بنایا تھا۔ یہ گویا اس عہد کا آخری شاہی محل تھا اور اسی میں بقول نعمت خانِ عالی اورنگ زیب عالمگیر غازی نے ابوالحسن کی جگہ اجلاس کیا تھا۔ چنانچہ مورّخ لکھتا ہے۔

بوالحسن داشت جا بہ چار محل　　کرد بیروں از آں مکاں تقدیر
چوں بروں رفت او بجاش نشست　　شاہ اورنگ زیب عالمگیر

قطب شاہی عہد میں چار مینار، چار بازار، چار سو کا حوض، چار کمان، اور چار محل کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ اور حسنِ اتفاق سے یہ نام اب تک شہرِ حیدرآباد میں زبان زد خواص و عوام ہیں۔

آصفی دور میں اگرچہ لفظ چار کو اتنی اہمیت حاصل نہ رہی لیکن حرفِ (چ) اس وقت بھی بہت مقبول رہا۔ اور متعدد بازاروں اور محلوں کے نام اسی سے شروع ہوتے ہیں۔ حیدرآباد کے کم باشندے ہونگے جو حسب ذیل بازاروں یا مقامات سے ناواقف ہوں۔

چیلہ پورہ۔ چمپا دروازہ۔ چوڑی بازار۔ چاوڑی سلیمان جاہ۔ چاوڑی ناما میاں۔ چوک۔ چاکنہ واڑی۔ چنگنی پورہ۔ چندولال کا بیلہ۔ چپل بازار۔ چوک اسپاں۔ چادرگھاٹ کا محلہ۔ چادرگھاٹ کا پل۔

چمبیلی منڈوہ چشتی چمن۔ چراغ علی گلی۔ چبوترہ سید علی۔ چار محل دروازہ۔ چنچل گوڑہ۔ چمپا پیٹیہ۔ چنچل گوڑہ۔ چکورہ مسجد۔ چھتہ بازار۔ چندرائن گٹہ۔ چلہ خواجہ۔ چماری دروازہ۔ چلکل گوڑہ۔ چمن گوڑہ۔ چوراہا جنسی۔ چمن افضل گنج۔ ان میں سے اکثر و بیشتر حیدرآباد کے نہایت آباد اور مشہور مقامات ہیں۔

کیا تعجب کہ حرف "چ" کی یہ کثرتِ استعمال موضع چچلم کی مناسبت سے ہو جس کے محلِ وقوع پر شہرِ حیدرآباد وبسایا گیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ خود لفظ چچلم میں دو "چ" واقع ہوئے تھے۔ اور حیدرآباد میں اس حرف سے شروع ہونے والے چونتیس سے زیادہ ناموں کے مقامات اور محلے موجود ہیں۔

چار محل اس جگہ بنایا گیا تھا جہاں اب عدالت العالیہ کے محاذی موسیٰ ندی کے کنارے سٹی کالج کی عمارت واقع ہے۔ یہ دراصل چار جداگانہ محل تھے جن کا رُخ ایک دوسرے کے مقابل تھا اور ان چاروں کے درمیان ایک بہت بڑا مربع حوض تعمیر کیا گیا تھا۔ جس کا طول ۵۴۰ فٹ اور عرض ۵۴۰ فٹ اور گہرائی ۹ فٹ تھی۔ اس حوض کے چاروں طرف نہر تھی۔ جس میں سیکڑوں فوارے چھوٹتے رہتے تھے۔

اس محل کی خصوصیات مورخ کے ان الفاظ سے واضح ہوں گی:۔

"ہر یکے ازآں چہار در شش جہتِ گیتی طاق است بغایت متانت و آراستگی و زیبائی و رنگینی ترتیب یافتہ و بہر گوشہ چہار محل چہار چمن متساوی الاضلاع بکمال زینت بر روئے کار آمدہ۔ و اطراف ہر چمن خیاباں بندی و انہار آب و آبشار ہا جاری شدہ۔" (ظفرہ صفحہ ۲۴)

اس محل میں ابوالحسن تاناشاہ اکثر دربار کرتا اور جشن مناتا اور نواڑے میں بیٹھ کر پانی اور فواروں کا لطف اٹھاتا۔ اس کی توصیف میں ایک شاعر نے جو نظم لکھی تھی اس کے چند شعر یہ ہیں۔

دریں گلشن چناں دیوانِ عام است	کہ در ہر گوشہ اش نور تمام است
صفا نوعے بہ سنگش نقش بستہ	کہ بازار بلور از وے شکستہ

مسجع صد ستوں از مشک و کافور | کہ گوئی ہر ستونش طرۂ خور
نظر بر چار طرفش می گماری | ببین گر طاقت نظارہ داری
چناں فوارہ سر بر اوج سودہ | کہ گوئی ساعد سیمیں نمودہ
الٰہی ایں بہشتِ پاک بنیاد | دریں باغ جہانش دار آباد

حویلی کام بخش

چار محل کی وسعت اور عظمت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ قطب شاہی سلطنت کے خاتمہ کے بعد شہزادہ کام بخش جب حیدرآباد میں بحیثیت صوبہ دار قیام گزیں ہوا تو اس نے شہر کے اس جدید ترین محل کو محض اس میں روشنی اور فرش و فروش کا انتظام نہ کر سکنے کی بنا پر چھوڑ کر اپنے لئے ایک علحدہ حویلی بنانی شروع کی۔ اورنگ زیب کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے فرزند کو ڈانٹا کہ:۔

"باوجود بودن مکانہائے متعدد قطب شاہی از سر نو عمارتِ نو با حداث در آوردن اصراف بے جا است۔ معلوم نشد کہ کدام فائدہ از آں مترتب بودہ باشد۔ جلد بعرض رسانند"

اس کے جواب میں شہزادہ نے عرض کیا:۔

"آنچہ ارشاد کرامت صرف صدور یافت عین مستحسن و در حقیقت حال چنیں است۔ اما فدوی را باوجود صوبہ داری و مختاری حیدرآباد و ممالک محروسہ متعلقہ آں مقدوری نیست کہ روشنی چراغہائے معمولی شام در آں عمارات عالی شان کہ بذاتہ می نمودہ باشد تا بہ روشنی تمام شب و بودن در آں جا و بسر بردن اوقاتہا چہ رسد۔ ایں حوصلۂ ہماں شاہان بابرکات و سلاطین صاحب نیات بودہ کہ دریں عمارت روشنی ہا کردہ تماشا ہا دیدہ۔ و خود تعمیر در



افضل الدولہ آصفجاہ خامس

آورده جشن ہائے شاہانہ نمودہ سکونت درزیدہ اند۔" (گلزارِ آصفیہ)

جوبلی کا نام بخش شہرِ حیدرآباد میں زمانہ حال تک موجود تھی اور جب پتھر گٹی کی سڑک کی توسیع کے لئے اس کے دونوں طرف کے مکانات منہدم کئے گئے تو کچھ حصہ اور بیرونی کمان بھی منہدم کردی گئی۔ البتہ جس جگہ یہ کمان واقع تھی وہیں بطور یادگار ایک کمان بنادی گئی ہے جو احمد علاء الدین کی موقوفہ مکہ مدینہ بلڈنگ کے سلسلہ میں کچھ فاصلہ پر موجود ہے۔

چارمحل میں بعد کو آصفی دور میں بارودخانہ قرار دیا گیا تھا۔ ۲۷ جمادی الثانی ۱۱۸۵ھ کو آگ لگ گئی اور بڑے دھماکے کے ساتھ محل منہدم ہوگیا۔ اور عرصہ تک ایک ٹیلے کیطرح پڑا رہا۔ اس مقام کو چارمحل کا گڈہ کہنے لگے اور اس پر ایک بہت بڑا محلہ آباد ہوگیا[1]۔ جو بعد کو موسیٰ ندی کی طغیانی ۱۹۱۱ء میں بہہ گیا۔ حال میں سٹی کالج کی تعمیر کے بعد جب اس کے عقبی حصہ کی عمارتیں منہدم کرکے کھیلوان کا میدان بنانے کے لیے اس ٹیلہ کو ہموار کیا گیا تو چارمحل کے عالی شان آثار برآمد ہوئے جو ظاہر کرتے تھے کہ یہ محل کتنا عالی شان ہوگا۔

چومحلہ ابوالحسن تاناشاہ کے چارمحل ہی کی طرز پر آصفجاہ خامس میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ نے ۱۲۷۵ھ میں ایک چومحلہ تعمیر کرایا تھا جو اب تک موجود اور محفوظ حالت میں ہے۔ ان چاروں محلوں کے درمیان بھی ایک خوبصورت حوض بنایا گیا ہے۔ لیکن ان محلوں اور حوض میں مغربی طرزِ تعمیر کی خصوصیات بھی جلوہ گر ہیں۔ اور وہ بلند برجیوں اور گنبدوں سے محروم ہیں جن سے تاناشاہ کا چارمحل آراستہ تھا۔

چومحلہ کا ہر ایک محل جدا جدا نام سے موسوم ہے۔ یعنے آفتاب محل، مہتاب محل، تہنیت محل، افضل محل۔ ان محلات میں نہ صرف آصفجاہ خامس بلکہ غفراں مکاں آصفجاہ سادس

---

[1] اسی چارمحل کے گڈے پر راقم الحروف کا آبائی مکان واقع تھا۔ اس لئے میرا عہدِ طفلی اسی جگہ بسر ہوا۔

بھی قیام کرتے تھے۔ اگرچہ آصفجاہ سابع نے ان کو کبھی استعمال نہیں کیا لیکن اس تحریر کے وقت تک یہ محل نہایت عمدہ حالت میں ہے۔ یعنی فرش وفروش، شیشہ آلات، اور فرنیچر و تصاویر سے مزین اور نہایت بارونق ہے۔

خلوت مبارک اور قصر جوبلی

اسی چو محلہ کے پہلو میں جانب شمال آصفجاہ سادس نے دربار عام کے لئے ایک عالی شان قصر کی تعمیر کی بنیاد رکھی تھی جو آصفجاہ سابع کے عہد میں تکمیل کو پہنچا۔ عوام میں اس قصر دربار کا نام خلوت مبارک مشہور ہے۔ چار مینار سے جانب مغرب جو لاڑ بازار واقع ہے اس میں سے موتی گلی اسی خلوت مبارک تک جاتی ہے۔ آصفجاہ سابع کے ابتدائی دور میں اسی خلوت مبارک میں دربار منعقد ہوتے تھے لیکن بعد کو انھوں نے اپنی سلور جوبلی کی یادگار کے طور پر باغ عام میں ایک نیا دربار ہال تعمیر کرایا جو قصر جوبلی کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن یہ قصر جوبلی، قصر خلوت مبارک کے مقابلے میں مختصر ہے اس کی طرز تعمیر اور زیبایش و آرایش میں مغربیت نمایاں ہے اور وہ خلوت مبارک کے اعلیٰ معیار اور نقش و نگار کو نہیں پہنچ سکا۔

اس کی تعمیر میں ساڑھے تین لاکھ روپے صرف ہوئے ہیں۔ اس کے اندرونی صحن کے وسط میں ایک خوبصورت اور بلند شہ نشین بنایا گیا ہے اور اس کی تعمیر کے لئے مشہور ہے کہ اٹلی سے بیش قیمت پتھر منگوائے گئے ہیں۔ طرز تعمیر کے لحاظ سے یہ پوری عمارت دور آصفجاہ سابع کی عماراتوں میں بہت خوبصورت سمجھی جاتی ہے۔

حویلی نظام الملک اور دوسری حویلیاں

قطب شاہی سلطنت کے زوال کے بعد حیدرآباد میں جتنی عمارتیں اس شہر کے حکمرانوں نے اپنے قیام کے لئے تیار کیں وہ زیادہ تر یک منزلہ تھیں۔ اور چونکہ ابتدا میں ان حکمرانوں کی حیثیت صوبہ داروں کی تھی اس لئے انھوں نے اپنی قیام گاہوں کو محل کی بجائے حویلی کے نام سے موسوم کیا۔ اس قسم کی پہلی حویلی رستم دل خاں نے بنوائی تھی جس کو اورنگ زیب عالمگیر نے اس کے والد جاں سپار خاں کی وفات کے بعد حیدرآباد کا صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ رستم دل خاں کو ہٹا کر جب شہزادہ کام بخش نے اس شہر میں قیام کیا تو اس نے بھی اپنی ایک علحدہ حویلی بنائی تھی جس کا ذکر گذر چکا ہے۔

جب ۱۱۳۷ھ میں نظام الملک آصفجاہ اول نے حیدرآباد کے آخری صوبہ دار عماد الملک مبارز خاں کو شکست دیکر حیدرآباد میں اپنی سلطنت قایم کی تو انھوں نے اپنے لئے ایک علحدہ محل تعمیر کیا جو پہلے پہلے حویلی نظام الملک کے اور بعد کو دولت خانۂ بندگان عالی اور خلوت مبارک کے نام سے مشہور ہوا۔ چارمینار سے جو شاہراہ پرانے پل کی طرف جاتی ہے اس پر چوک کو پہنچنے سے قبل ہی موجودہ لاڑ بازار کی بائیں جانب یہ حویلی واقع ہے۔

قطب شاہی عہد میں اس جگہ ایک عمدہ شاہی عمارت بنائی گئی تھی جس کا نام جلا محل تھا اور جس میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کی بڑی دختر اور داماد سیدا حمد رہا کرتے تھے۔ اسی جلا محل کو نظام الملک آصفجاہ نے اپنے قیام کے لئے پسند کیا اور اس کے احاطے میں دیوانِ عام، خلوت، خوابگاہ اور محلسرا کے جدا جدا حصے تعمیر کرائے۔ سڑک کی طرف ایک جلوخانہ

اور نقار خانہ بھی تعمیر کرایا۔ اور محل کے اطراف احاطہ کی ایک اونچی دیوار بھی بنوادی۔ اس محل کے صحنوں میں کئی حوض بنائے گئے جن میں سے بعض بہت طویل اور خوبصورت ہیں۔ ان سب حوضوں میں تالاب جل پلی سے پانی لایا گیا تھا۔ یہ سب آج تک اصلی حالت میں موجود ہیں۔ اور ان عمارتوں میں علاقہ صرف خاص کے صدر المہام معتمد اور دوسرے عہدہ داروں کے دفاتر ہیں۔

حویلی نظام الملک کے جلو خانہ کا دروازہ حویلی کے شایان شان نہ بن سکا اس لئے کہ اس جگہ سڑک پر ریشم کے ایک پٹوہ گر کی دوکان اور مکان تھا جس نے باوجود خوشامد اور خاطرداری کے اپنا آبائی مکان فروخت کرنا پسند نہ کیا جب نظام الملک کو اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے حکم دیا کہ اس کو ہرگز مجبور نہ کیا جائے اور دروازہ ایک طرف کو ہٹا کر چھوٹا ہی بنا دیا جائے۔

اس حویلی کے علاوہ آصفجاہ اول نے قطب شاہی گوشہ محل کے میدان میں حوض کے کنارے لکڑی کا ایک بنگلہ اور حیدر محل بھی بنوایا تھا۔ یہ حیدر محل اب بھی موجود ہے اور اس میں شہر حیدرآباد کا میسانک لاج واقع ہے۔

حویلی منجھلی بیگم نظام الملک آصفجاہ اول کے بعد ناصر جنگ، مظفر جنگ اور صلابت جنگ کی عمل داریوں میں شہر حیدرآباد کی طرف توجہ ہی نہیں کی گئی تاآنکہ نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کا زمانہ آیا جنھوں نے اس شہر کو مستقل طور پر اپنا پایہ تخت بنایا اور آصفجاہ اول کی حویلی میں چند مزید عمارتوں خس خانہ اور خواص پورہ وغیرہ کا اضافہ کیا۔ اس حویلی کے عقب میں جانب جنوب ان کی ہمشیر منجھلی بیگم کی قیام گاہ تھی جو اب تک موجود ہے اگرچہ اب اس کے کچھ حصے ویران اور خستہ ہو گئے ہیں۔ یہ حویلی منجھلی بیگم کہلاتی ہے۔ یہ ایک نہایت مختصر یک منزلہ عمارت ہے۔ اسکے کچھ حصے قطب شاہی عمارتوں کے تہہ خانوں پر بنائے گئے ہیں۔ چار مینار سے جو راستہ شاہ علی بنڈہ کی طرف

جاتا ہے اس پر اس حویلی منجھلی بیگم کا باب الداخلہ واقع ہے۔ اور اس میں بھی علاقہ صرفخاص کے کچھ دفتر ہیں۔

نظام علی خاں کے زمانے کی اور عمارتیں روشن بنگلہ، روشن محل، غنی محل، نوازش محل، گلشن محل، شادی خانہ وغیرہ بھی اب تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں لیکن یہ عمارتیں صحیح معنوں میں شاہی محلات کہلانے کی مستحق نہیں ہیں۔

حویلی رکن الدولہ

نظام علی خاں کے شوق تعمیر کو دیکھ کر ان کے وزیر اعظم رکن الدولہ نے بھی قدیم صوبہ دار حیدرآباد رستم دل خاں کی حویلی خرید کر اس میں جدید وضع کے چار محل، محلسرا، نقارخانہ، جلوخانہ اور دیگر ضروری عمارتیں بنوائیں۔ یہ حویلی اب اس نام سے حیدرآباد میں موجود نہیں ہے۔

پنج محلہ

حویلی نظام الملک کے عقب میں مکہ مسجد کے محاذی ایک زمین افتادہ پڑی ہوئی تھی۔ اکو نظام علی خاں کے ایک امیر محمد طاہر خاں امیر جنگ نے خرید کر اس میں ایک نہایت عمدہ باغ کی طرح ڈالی اور اس کے درمیان ایک پنج منزلہ عمارت بنائی جس کا نام پنج محلہ مشہور رہوا۔ اس عمارت اور باغ کی زیبایش و آرائش کے لئے امیر جنگ نے خاص اہتمام سے کام لیا تھا۔ اس کے چاروں طرف چار حوض بنائے گئے جس کے فوارے عالی شان اور چبوترے سنگ مرمر کے فرش سے آراستہ کئے گئے تھے۔ یہ محل بعد کو شاہی قبضے میں آگیا اور اسی کے عقب میں قصر چو محلہ بنایا گیا تھا جس کا ذکر گذر چکا ہے۔

پرانی حویلی

یہ دراصل میر محمد مومن پیشوائے سلطان محمد قلی قطب شاہ کا محل تھا جو انھوں نے بنائے حیدرآباد کے وقت ہی "دولت خانۂ عالی" یعنی شاہی محل کی تعمیر کے ساتھ ہی بنوایا تھا۔ چونکہ یہ وزیر اعظم اور پیشوائے سلطنت کی قیام گاہ تھی اس لئے میر مومن نے اس کے محل وقوع اور تعمیر میں کئی مصلحتوں سے کام لیا تھا اور شاہی محلسراؤں سے ہٹ کر شہر کے ایک دوسرے حصہ میں جانب مشرق تعمیر کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی عہد کے جملہ پیشوایان سلطنت یکے بعد دیگرے اسی میں قیام پذیر رہے۔ اور اسطرح آصفی عہد تک اسکی کچھ عمارتیں باقی ہیں۔ اس کے باب الداخلہ کی کمان بھی

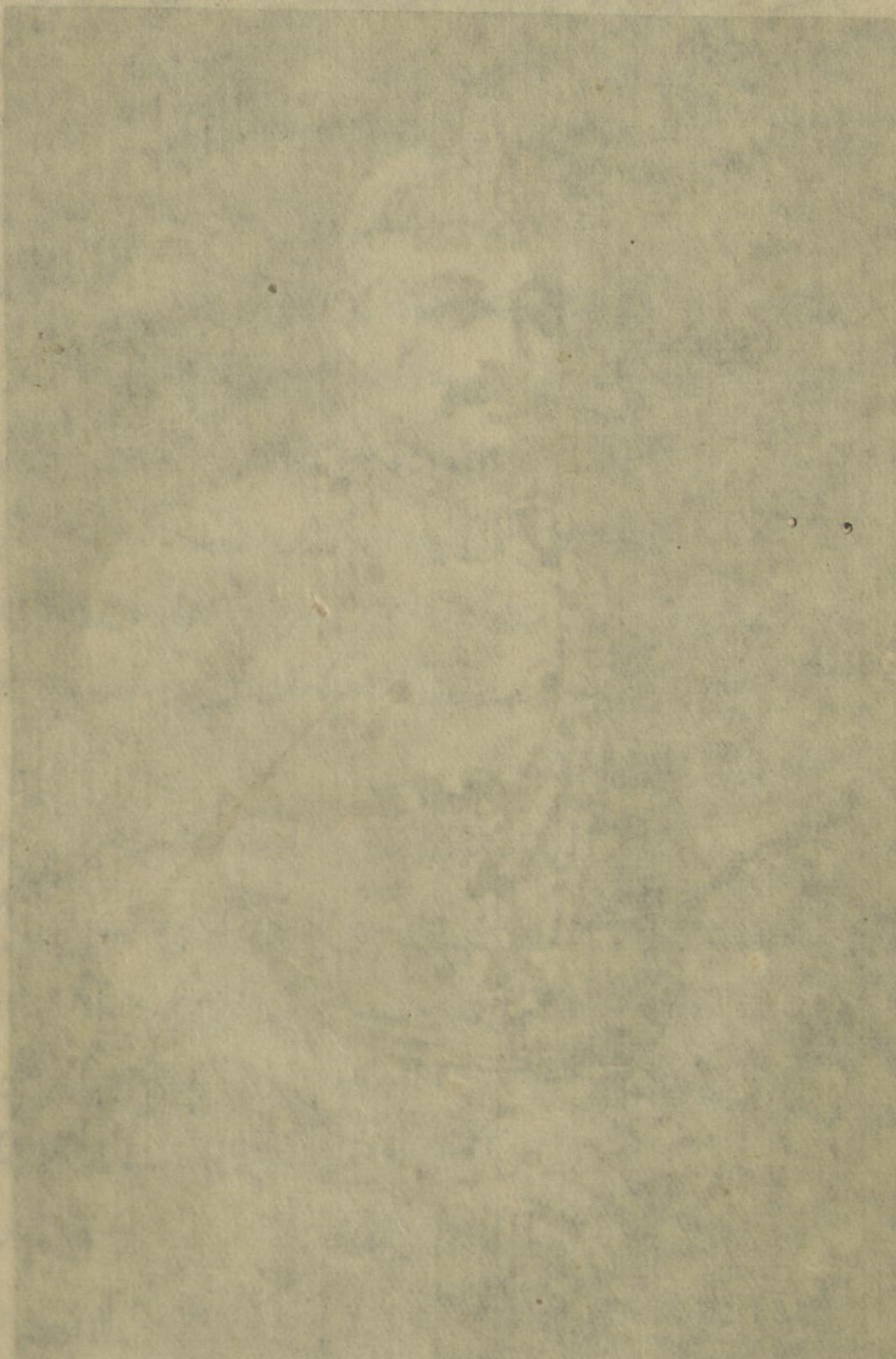
حال حال تک موجود تھی۔ عہد آصفجاہ ثانی میں جب حیدر آباد دکھر سے پایۂ تخت بنا اور آباد ہونے لگا تو شہر کی شاہی اور سرکاری عمارتیں حسبِ ضرورت استعمال میں آنے لگیں۔ اور یہ حویلی قدیم بھی اقربائے سرکار کی رہائش گاہ قرار پائی۔ چنانچہ ان کے ایک فرزند سکندر جاہ جو بعد کو ان کے جانشین ہو کر آصفجاہ ثالث کہلائے ایام شہزادگی میں اسی حویلی میں فروکش ہوئے۔ اور اپنی ضرورت کے مطابق اس میں کئی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ ان کے بڑے فرزند اسی محل میں مقیم تھے کہ سکندر جاہ کی وفات کی خبر ملی۔ اور ناصر الدولہ کی جانشینی کا اعلان اسی حویلی قدیم سے کیا گیا اور یہیں سے شاہی جلوس نکلکر حویلی نظام الملک میں پہنچا اور خلوت مبارک میں تخت نشینی عمل میں آئی۔ اس کے بعد سے اگرچہ آصفجاہ رابع پنج محلہ میں قیام پذیر ہو گئے لیکن پرانی حویلی کی رونق بھی کم نہ ہونے پائی۔ اور خاصکر آصفجاہ خامس و آصفجاہ سادس نے تو اس کو شاہی فرودگاہ کے طور پر زیادہ تر استعمال کیا۔ اس اثنا میں اس کے احاطہ میں کئی عمارتیں بنائی گئیں جو اب تک فرش و فرنیچر سے آراستہ اور بارونق ہیں۔ اور چونکہ آصفجاہ سابع کی والدہ اس میں قیام پذیر تھیں اسلئے وہ ان کی زیارت کے لئے روزآنہ شام کے وقت اس میں جاتے رہے اور ان کی وفات کے بعد بھی اب تک تشریف لیجاتے ہیں۔

کنگ کوٹھی

یہ دراصل عہد میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس کے ایک امیر کمال خاں کا بنگلہ تھا جو انگریزی کوٹھیوں کی طرز پر شہر حیدر آباد کے باہر جانبِ شمال بنایا گیا تھا۔ اس بنگلے میں کمال خاں نے اپنے نام کی مناسبت سے جگہ جگہ انگریزی حروف KK کندہ اور نسبت کرائے تھے۔ یہ بنگلہ بعد کو شاہی قبضے میں آگیا اور آصفجاہ سادس نے اپنے بڑے شہزادے میر عثمان علی خاں اور ان کی دلہن کے قیام کے لئے اس کو مختص کیا تو انھیں اتنا پسند آیا کہ تخت نشین ہونے کے بعد بھی وہ اسی میں قیام پذیر رہے اور چونکہ شاہِ وقت کی قیام گاہ بن گیا تھا اور اس کے در و دیوار پر حروف KK نمایاں تھے اس لئے عام طور پر کنگ کوٹھی مشہور ہو گیا۔ اس احاطے میں بعد کو کئی اور بنگلے تعمیر کئے گئے اور اسکے احاطے کی دیواریں بلند کر دی گئیں۔ یہ اگرچہ کوئی عالی شان محل نہیں ہے تاہم بادشاہِ وقت کی قیام گاہ کی بنا پر قصرِ کنگ کوٹھی مبارک کہلاتا ہے۔



ناصر الدولہ آصف جاہ رابع



حیدر آبادی لیل و نہار کی داستانیں

پچھلم کی رقاصہ

۹۸۶ ہجری

نوعمر شہزادہ کا اضطراب کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ بادشاہ نے یہ غلط اندازہ کیا تھا کہ اس کے لختِ جگر کی بھاگ متی سے محبت عنفوانِ شباب کی امنگوں اور جذبۂ ہوس رانی کا نتیجہ ہے۔ اس نے شہزادہ کو بالا حصار کے ایک پُرفضا محل میں بند کر دیا۔ عرب، ایران ارمینیا، ترکی، گجرات اور تلنگانہ کی ہر حسین لڑکی بڑے اہتمام اور چھان بین کے بعد اس محل میں جمع کر دی گئی اور ان بیسیوں منتخب مہ جبینوں میں سے ہر ایک کو خود بادشاہ نے بہ نفسِ نفیس سمجھا دیا کہ جو کوئی نوجوان ولیعہد سلطنت کو اپنی طرف مائل کرے گی اور پچھلم کی رقاصہ کا خیال اس کے دل سے نکال دے گی وہی اس عظیم الشان سلطنت کی ملکہ قرار دی جائے گی اور اسی کی نسل سرزمین دکن کے سیاہ و سفید کی مالک رہے گی۔

اس سے بڑھ کر ایک عورت کی، وہ بھی غریب الوطن مقید عورت کی آرزوؤں اور ارمانوں کی معراج کیا ہو سکتی تھی؟ ہر ایک نے اپنے حسن و جمال کے مظاہرہ سے سرمست شباب اور خوبرو شہزادہ کے دل پر قبضہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ایک سے بڑھ کر ایک نے اپنی محبت اور فدائیت کا ثبوت پیش کرنا شروع کیا۔

تریا چرتر سے کون واقف نہیں؟ اگر ایک حسین و عشوہ طراز دیوی اپنی رعنائیوں اور دلفریبیوں کی جلوہ نمائیوں کے ساتھ کسی مرد سے اپنے عشق و محبت اور وارفتگی کا اظہار کرے تو کیا دنیا میں ایسی کوئی طاقت ہے جو مرد کو اس کے آہنی پنجہ سے چھڑا سکے؟ لیکن شہزادہ محمد قلی اس غیر معمولی

طاقت سے محروم نہیں تھا. وہ کسی اور پر عاشق تھا اور اس کا معشوق جہلم کی ایک کم عمر بھولی بھالی غریب ملنگن تھی جس کو خوش قسمتی یا بدقسمتی سے رقص کی تعلیم و تربیت دی گئی تھی مگر بادشاہ کی فراہم کردہ حسینانِ جہاں ان دونوں کے عشق کی اتھاہ گہرائیوں سے کیا واقف؟ انھیں تو بس ایک ہی دھن تھی ان کا فرض تھا کہ خود کو شہزادہ پر فریفتہ ثابت کریں اور سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے اکثر اس کے مردانہ حسن، اٹھتی جوانی اور سپاہیانہ انداز پر سچ مچ عاشق ہو گئی تھیں ان سبھوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ شہزادہ ان میں سے کم از کم کسی ایک ہی کی طرف مائل ہو جائے۔

کوئی عمداً اپنے شانہ سے ڈوپٹے کو ڈھلکا دیتی، کوئی اپنے صاف و شفاف سیمیں جسم کا نشیب و فراز دکھانے کے لئے ایسے کپڑے پہنتی جن کا پہننا نہ پہننا برابر تھا۔ کوئی سرمست شباب شہزادہ کو چھیڑنے کے لئے حوض کا پانی اچھالتی، کوئی چلتے چلتے اس کی بلائیں لینے کے لئے رک جاتی، کوئی اس کے گلے میں باہیں ڈال دیتی، کوئی اس کے پہلو میں لپٹ جاتی، کوئی اس کے قریب اس انداز سے گر جاتی کہ وہ لامحالہ اس کو اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھائے اور اس طرح کم از کم اپنے جسم سے پہلی دفعہ ایک مرد کا (اور وہ بھی شہزادہ جیسے نوجوان کا) ہاتھ تو لگ جائے، کوئی اپنی بیتاب جوانی اور اپنے بے پناہ حسن و جمال کی عریاں نمائش کے لئے پانی میں کود پڑتی۔ غرض کوئی بات نہ تھی جو نہ کی گئی ہو۔ کئی لڑکیوں نے شہزادہ کا رازدار بننے کی بھی کوشش کی مگر صرف اس حد تک کامیابی ہوئی کہ اس نے ایک آدھ دفعہ اپنا کوئی خواب نیند میں سے چونک کر بیان کر دیا اور بس۔ اس نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا تھا کہ بھاگ متی اس کے فراق میں بے چین ہو کر بالاحصار میں داخل ہو گئی اور اس کی مسہری تک پہنچ گئی ہے وہ ہاتھ بڑھا کر اس سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہے لیکن وہ پیچھے کی طرف ہٹتی جا رہی ہے۔ اور جہاں اس نے اٹھ کر اس کو پکڑنے کی کوشش کی اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان عرب حسینہ اس کا ہاتھ تھامی ہوئی ہے۔ وہ بے تحاشا رونے لگا اس کی آہوں اور سسکیوں نے اسکی اکثر چاہنے والیوں کو بیتاب کر دیا۔ ان کی پرخلوص منت سماجت اور تسلی دلا دی

سے مجبور ہو کر اس نے ان کے سامنے اپنا خواب دہرایا مگر اس وعدہ کے بعد کہ اس کا ذکر سلطان ابراہیم قطب شاہ تک نہ پہنچنے پائے۔

ان سبھوں نے نہایت پرخلوص انداز میں اس کو دلاسا دیا اور کہا کہ ایک بازاری عورت کی محبت کا کیا بھروسہ۔ تم کسی اور سے محبت کرو۔ تمھارے لئے دنیا کے ہر بادشاہ کی حسین سے حسین لڑکی تلاش کی جاسکتی ہے۔ ہم سب تو تمھاری لونڈیاں ہیں اور تم پر سے اپنی جان قربان کرنے کو ہر وقت تیار ہیں مگر تم خدا کے لئے اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو۔ کسی اور کے ساتھ دلچسپی پیدا کرلو۔

شہزادہ لگاوٹ کی باتوں سے بھی نرم ہونے والا نہ تھا۔ اس نے اندوہناک لہجہ میں اپنے باپ کے ایک درباری شاعر وجہی کا یہ شعر پڑھا:-

اک ٹھا میں سہیلی مرنا، دل وچ پرنا دھر اس پیو کوں اپنا کرنا، اس پاپی جیو کوں کھوئے کر

اور کہا "اے میری ہم نشینو! ایک ہی پر مرنا وہ سرے سے دل نہ لگانا، اسی ایک پیا کو اپنا بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے خواہ اس کی راہ میں اپنا یہ پاپی جسم تک کیوں نہ کھو دینا پڑے"۔

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ مگر فراق کی گھڑیاں آسانی سے نہیں کٹتیں۔ دن رات میں کئی کئی بار اندوہگیں شہزادہ اپنے محل کے بالاخانہ پر چڑھ جاتا اور موضع چچلم کی طرف ٹکٹکی باندھے رہتا۔ مگر اس کے محبوب کا مکان اتنا بلند نہیں تھا کہ گاؤں کے اطراف و اکناف کے درختوں کے جھنڈ میں سے کم از کم اس کی دیواریں ہی نظر آجائیں۔ وہ سوچتا اگر اس وقت میرا بس چلتا تو بھاگ متی کے مکان کو اپنے محلسرا میں اٹھا لاتا یا کم از کم اُسی جگہ اس کا مکان اتنا بلند بنا دیتا کہ میں یہاں بیٹھے ہر گھڑی اس کے نظارہ سے اپنی آنکھیں روشن کر سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنے اس خیال کو بعد میں پورا کیا جب مشہد مقدس کے طرز پر شہر بھاگ نگر کی بنیاد ڈالی اور عین بھاگ متی کے مکان کی جگہ پر چار مینار جیسی رفیع الشان عمارت

تیار کرادی تاکہ ہر وقت اور ہر جگہ سے اس کو دیکھتا رہے۔

ایک رات اسی طرح شہزادہ اپنے محل پر چڑھ رہا تھا کہ یکایک اس کی نظر موسیٰ ندی پر پڑی جو طغیانی کی وجہ سے ہیبت ناک سمندر کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ کئی روز سے مسلسل بارش ہو رہی تھی اور ندی کے زور سے بہنے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی لیکن یہ نہیں معلوم ہوسکا تھا کہ ایسی زبردست طغیانی آئی ہوگی۔ اب جو موسلا دھار بارش تھمی، اور چاند بے نقاب ہونے لگا تو شہزادہ کو بالاخانہ پر چڑھنے کا موقع ملا۔

ندی کو دیکھ کر ساتھ ہی اس نے موضع چچلم کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں آج رات ایک چراغ بھی نظر نہیں آرہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو تمام گاؤں نذرِ سیلاب ہوگیا یا طغیانی کے خوف سے بستی والے گھر بار چھوڑ کر اطراف واکناف کی پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہوئے ہیں۔ بہرصورت بھاگ متی کے لئے تشویش کا موقع تھا۔ اسوقت شہزادہ کی فکر و تردد کی کوئی انتہا نہ تھی۔ دیکھتے دیکھتے وہ مہ رخوں کے جھرمٹ سے تیر کی طرح چلا، اور محلسرا سے نکل کر سیدھا بالاحصار کے باہر پہنچ کر دم لیا۔ وہاں ہر وقت ان امیروں کی سواریاں، ہاتھی اور گھوڑے وغیرہ تیار رہا کرتے تھے جو اپنی نشست بدلنے کے لئے باری باری سے شاہی جلوخانہ میں آیا کرتے تھے۔ بالاحصار کے بیرونی دروازہ پر سپاہی ننگی تلواریں لئے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ایک بجلی تھی جو اندر سے باہر کی طرف نکل گئی۔ ان میں سے بعض دوڑتے ہوئے باہر کی طرف آئے اور دیکھا کہ شہزادہ ولیعہد سلطنت تنہا ایک ہاتھی پر سوار ندی کی طرف بڑھے چلے جارہے ہیں انھوں نے گھوڑوں پر سوار ہوکر ان کا تعاقب کیا اور قریب پہنچکر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ شاہی رعب چھا گیا ان میں سے چند تو ہاتھی کی دائیں بائیں جانب ہوگئے اور چند واپس گئے تاکہ دروازہ کے صدر محافظ کو اس حادثہ ناگہانی سے واقف کرکے جہاں پناہ کو مطلع کریں۔

چشم زدن میں شہزادہ کا ہاتھی موسیٰ ندی پر پہنچ گیا جو طغیانی کی وجہ سے اپنی مقررہ حد سے بہت دور تک بڑھ آئی تھی۔ شہزادہ نے ہاتھی کو پانی میں بڑھایا مگر اس زور کا سیلاب تھا کہ ہاتھی کے قدم ڈگمگانے لگے۔ پُر شور موجیں اس کے پہلو سے ٹکرا کر شہزادہ کے جسم تک پہنچنے لگیں۔ اور ہاتھی ہے کہ ایک قدم آگے بڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ شہزادہ نے بہت کچھ کوشش کی مگر ناکام۔ آخر تنگ آکر ہاتھی پر سے کود پڑا، اور ایک سپاہی کے گھوڑے پر جو نزدیک تھا سوار ہو گیا۔ اقبال مند شہزادہ کا ایڑ لگانا تھا کہ گھوڑا کشتی کی طرح پانی میں تیرنے لگا اور تھوڑی دیر میں دوسرے ساحل پر پہنچ گیا۔ شہزادہ نے اطمینان کا سانس لیا جب دیکھا کہ چچلم کی صرف بیرونی آبادی تہ آب ہوئی ہے اور اندرون موضع کی آبادی پانی کی زد سے محفوظ ہے۔ وہ ایک آن میں بھاگ متی کے قریب پہنچ گیا جو گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر اپنے عاشق جانباز کے انتظار میں دروازہ پر منتظر کھڑی تھی۔

سلطان ابراہیم قطب شاہ کو شہزادہ کی اس خطرناک جرأت کی اسی وقت خبر ہوئی جب کہ شہزادہ خطرہ سے باہر ہو چکا تھا۔ بادشاہ نے اس واقعہ کے دوسرے دن ندی پر پل بنانے کا حکم دیا جو موسیٰ ندی کا پہلا پل تھا، اور آج حیدرآباد کے باشندے اس کو پرانا پل کہتے ہیں۔

مشکِ محل

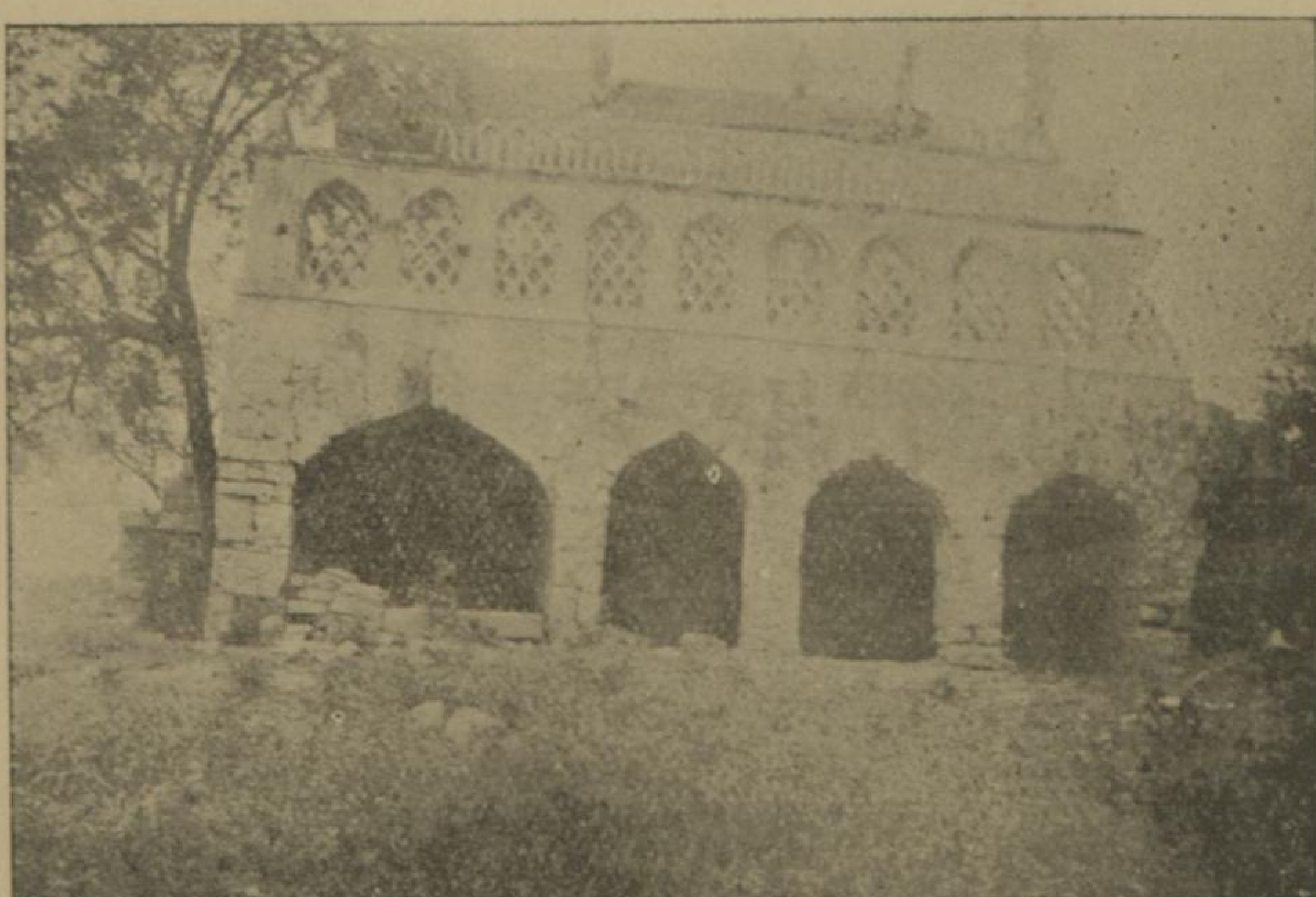
بھاگ نگر کو آباد ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اکثر عمارتیں ابھی زیرِ تعمیر ہیں، موسیٰ ندی کے کنارے سرسبز و شاداب باغوں کی داغ بیل ڈالی جارہی ہے، دولت خانۂ عالی کی تزئین و آرائش ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے امرائے عظام بھی شاہی حکم کی تعمیل میں اپنے اپنے عشرت کدوں کی طرح اندازی میں سرگرم ہیں۔

گولکنڈہ کی دولت، عیش و عشرت اور علمی و ادبی قدر و منزلت کے افسانے بیجاپور اور شاہجہاں آباد سے گزر کر اصفہان و سمرقند تک پھیل چکے ہیں۔ تاجروں اور قسمت آزماؤں کا ہر قافلہ ایران و توران اور روم و شام سے نکلتے وقت بھاگ نگر کے صاحب ذوق بادشاہ اور فیاض امیروں کے درباروں اور ڈیوڑھیوں تک رسائی حاصل کرنے کو اپنی قسمت کی معراج سمجھتا ہے۔ روئے زمین کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں کے انسان بھاگ نگر اور گولکنڈہ کے بازاروں میں نظر نہ آتے ہوں۔ یہاں کی گلیوں میں طرح طرح کی بولیاں سنائی دیتی ہیں۔ آئے دن نو واردوں کا ایک نہ ایک کاروان یا قافلہ گولکنڈہ کی سر بفلک فصیلوں کے سایہ میں خیمہ افگن نظر آتا ہے۔ اور شاید ہی کوئی بدنصیب ہوگا جو رودِ موسیٰ کے دامن نشینوں کی فیاضی اور غریب نوازی سے محروم جاتا ہو۔

بھاگ نگر کے جنوب و مغرب کی طرف رودِ موسیٰ کے جنوبی ساحل پر ایک عظیم الشان عمارت کی بنیادیں تیار ہو رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی دربار کا کوئی ذی رتبت امیر بھاگ نگر سے ذرا ہٹ کر ایسی جگہ اپنے لئے ایک شبستان تیار کرنا چاہتا ہے جہاں وہ



مشک محل



مسجد ملا خیالی

وہ ہر صبح اپنے محبوب قلعہ کی فصیلوں اور ان کے دائمی نگہبان بالاحصار کی زیارت، اور ہر شام اپنے آقا کی پیاری بستی کے لاتعداد چراغوں سے اپنی آنکھوں کو روشن کر سکتا ہو۔

انہی بنیادوں کے قریب ندی کے اس پار ایک نیا قافلہ خیمہ زن ہے جس کے ارد گرد بیسیوں اونٹ نظر آرہے ہیں۔ صبح کا سہانا وقت ہے۔ آفتاب کی کرنیں ابھی ابھی بالاحصار کی بالائی چوٹیوں پر چمکنی شروع ہوئی ہیں گولکنڈہ کی فصیلوں کی طرف سے چند سوار موسیٰ ندی کی آہستہ خرام موجوں کی طرف بڑھتے نظر آرہے ہیں اور اُن کا رُخ ندی پار کے اسی زیرِ تعمیر محل کی جانب پلٹا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ ابھی ندی تک پہنچنے نہیں پاتے ہیں کہ ان کے سردار کی نظر ان اونٹوں اور ان کے درمیان کے خیموں پر جا پڑتی ہے اور فوراً اس کے گھوڑے کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے قریب کے ایک سوار سے پلٹ کر پوچھتا ہے۔

"یہ قافلہ ایک عرصہ سے یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"جہاں پناہ! شاید ان کا مشک ابھی فروخت نہیں ہوا" سوار نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

"کیا یہ مشک لے آئے ہیں؟ تعجب ہے گولکنڈہ میں مشک کا سوداگر اتنے عرصے تک پڑا رہے!"

یہ کہہ کر سردار نے اپنا گھوڑا ندی میں ڈال دیا اور تھوڑی دیر میں وہ اور اُس کے ہمراہی اس زیرِ تعمیر محل کی بنیادوں تک پہنچ گئے۔ وہاں انھیں ایک اجنبی شخص نظر پڑا جو شاید ان بنیادوں کی طرف تفریحاً نکل آیا تھا۔ جب وہ ذرا قریب ہوا تو سب کی توجہ اس کی طرف منعطف ہو گئی اُس کو دیکھتے ہی قریب کے ہمراہی نے اپنے آقا سے آہستہ عرض کیا۔

"یہی اس قافلے کا قافلہ سالار اور ملکُ التجّار ہے"۔

"تم اتنے دن سے یہاں کیا کر رہے ہو؟" آقا نے استعجاب کے لہجہ میں سوداگر سے پوچھا۔

"حضور ہم کچھ بدنصیب سے معلوم ہوتے ہیں" گولکنڈہ میں کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ جس سلطنت میں آپ جیسے امراء ہوں اور جہاں کا بادشاہ دُنیا کے تمام بادشاہوں سے زیادہ ایسی چیزوں کی قدر کرتا ہو تعجب ہے کہ ہم اتنے دن محروم رہیں"۔

تاجر نے نہایت مودبانہ لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ وہ اس وقت خود جہاں پناہ سے مخاطب ہے۔ اس کو یقین نہ آسکتا تھا کہ جس سلطنت کے معمولی معمولی امراء بھی بغیر شایانِ شان جلوس اور تزک و احتشام کے باہر نہیں نکلتے اور کبھی کسی اجنبی سے اس بے تکلّفی سے مخاطب نہیں ہوتے وہاں کا فرمانروا ایسا خلیق اور غریب نواز ہوگا۔ وہ کئی دفعہ گولکنڈہ آچکا تھا لاکھوں روپیوں کا مال فروخت کرچکا تھا لیکن بادشاہ سے گفتگو کرنا تو کجا اس کے دربار تک رسائی بھی نہیں ہونے پائی تھی۔

"تعجب ہے کہ ہم اتنے دن محروم رہے" ناواقف تاجر نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی امیر اتنا مشک وقت واحد میں خریدنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے، ہم نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح بادشاہ سلامت کو خبر ہوجائے ہم بڑی امیدوں سے گولکنڈہ آئے تھے۔ لیکن معلوم ہوا کہ چند ماہ قبل ہی یہاں اتنا مشک خریدا جاچکا ہے کہ اب شاید کئی سال تک مشک کی ضرورت نہ ہو مگر اس کے باوجود بھی ہمیں یقین ہے کہ

خدّامِ سلطانی آمادہ ہو جائیں اور جہاں پناہ تک ہماری خبر پہنچ جائے تو یقیناً ہمارے نصیب جاگ اٹھیں گے۔ ہمارے ساتھ اتنے اونٹ مشک ہے کہ شاید ہی بیجا پور یا شاہجہاں آباد میں فروخت ہو سکے۔ اگر سرکار ہی ہماری خبر ظل اللہ تک پہنچا دیں تو غریب پروری ہو گی اور ایک اونٹ مشک سرکار کے نذر کیا جائے گا۔"

آخری جملہ سنتے ہی بادشاہ سلامت نے گھوڑا پلٹا کر اپنے ہمراہی سے کہا:۔

"تاجر سے کہدو کہ آج سہ پہر میں دولت سرا پر چوک کے جھروکے کے نیچے حاضر رہے۔"

تاجر ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ گھوڑے موسیٰ ندی تک پہنچ گئے۔

سہ پہر میں شہر کی اس شاہراہ کے دروازے پر تاجر بے چین کھڑا ہے جو گولکنڈہ سے بھاگ نگر کو جاتی ہے اور موسیٰ ندی کے خوبصورت پل کے ایک سرے پر واقع ہے۔ اس پل کی طرز تعمیر و آرایش نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ میں بھی بے نظیر سمجھی جاتی ہے۔ ہیروں کی تجارت کے لئے جو فرنگی سیّاح گولکنڈہ آتے ہیں وہ اس پل کو شہر پیرس کے جدید ترین پل سے بھی کسی طرح کم نہیں سمجھتے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس پل کے دروازہ میں سے بھی شہر میں داخل ہونے کے لئے ہر اجنبی شخص کو اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے جس کے لئے بعض وقت کئی کئی دن تک انتظار کرنے کی نوبت آتی ہے۔

تاجر بھی اسی شش و پنج میں ہے کہ کسی طرح اجازت نامہ مل جائے اور پہنچ کر اس امیر کی عنایت سے بادشاہ تک رسائی حاصل کر سکوں جو صبح میں اعانت کا وعدہ کر گیا ہے۔ اُمید و یاس کی کشمکش میں وہ محسوس کر رہا ہے کہ میں ایسا خوش قسمت تھوڑا ہی ہوں کہ ڈھائی مہینوں کی کوششوں میں ناکام رہ کر آج بغیر کسی کوشش کے گھر بیٹھے کامیاب

ہو جاؤں جب یہ جانتا ہوں کہ اس سال مشک خریدا ہی نہیں جا سکتا۔ پھر وہ خیال کرتا ہے کہ خدا دینا چاہتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ ابھی اسی ادھیڑ بن میں ہے کہ ایک حبشی دروازے میں نمودار ہوتا ہے اور مشک کے تاجر کو اپنے ساتھ لے کر چوک میں داخل ہوتا ہے۔ یہاں جب تاجر کی نظر شاہی جھروکے پر پڑتی ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ وہ اب تک اپنے جس خلیق محسن کو ایک قطب شاہی امیر سمجھ رہا تھا وہ خود ظل اللہ ہیں۔

بادشاہ نے تاجر کو دیکھتے ہی خانساماں کو حکم دیا کہ

"اس تاجر کے مشک کی رقم فوراً ادا کر دی جائے"۔

خانساماں نے ڈرتے ڈرتے دست بستہ عرض کیا کہ :۔

"جہاں پناہ! مشک کے کوٹھے تو بھرے پڑے ہیں اتنے اونٹ مشک کہاں رکھا جائے گا؟"

بادشاہ نے تاجر کی طرف دیکھ کر کہا :۔

"تم اپنا سارا مشک ہمارے ایک امیر کے اس زیر تعمیر محل کی بنیادوں میں ڈال دو جہاں آج صبح ہم ہوا خوری کے لئے نکل آئے تھے"۔

دوسرے دن خوش قسمت تاجر کے خیمے موسیٰ ندی کے دامن میں نظر نہ آئے لیکن اسی روز سے اس زیر تعمیر محل کا نام "مشک محل" مشہور ہو گیا۔

مکہ مسجد

۱۰۲۳ھ

آج صبح سے حیدر آباد کے بازاروں میں عجیب چہل پہل ہے۔ انسانوں کا ایک سیلاب ہے کہ ہر گلی کوچے سے چار مینار کی طرف جانے والی سڑکوں میں داخل ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چاروں سڑکیں بڑے بڑے دریا ہیں جن میں چھوٹی چھوٹی ندیوں اور نالوں سے آنے والے سیلابوں کی وجہ سے طغیانی کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ انسانی سیلاب ایک ہی مرکز کی طرف بہہ رہا ہے اور چار مینار تک پہنچ کر جنوب مغرب کے عظیم الشان میدان میں جذب ہوتا جاتا ہے۔

نوجوانوں کی ٹولیاں اپنی وضع قطع اور چست لباس میں زندگی اور زندہ دلی کا صحیح نمونہ پیش کر رہی ہیں۔ بڑے بوڑھے اور ثقہ لوگ اپنے اپنے ہتھیار سنبھالے اور وضع وضع کی لٹپٹی پگڑیاں لپیٹے چلے آ رہے ہیں۔ کوئی بادشاہ کے غیر معمولی زہد و اتقاء اور مذہبی شغف کا ثناخواں ہے۔ کوئی اس کی درویش صفت زندگی کے قصے سنا رہا ہے۔ کسی کی زبان پر سلطنت کی ہردل عزیز ملکہ حیات بخشی بیگم کے رفاہِ عام کے کاموں اور خیر خیرات کا تذکرہ ہے اور کوئی اس کے باپ سلطان محمد قلی کی فیاض طبیعت اور اس کے زمانے کی رنگ رلیوں سے موجودہ عہد کا مقابلہ کر رہا ہے۔ لیکن اکثروں کی گفتگو کا موضوع آج ہی کی تقریب ہے جس میں شرکت کے لئے اس ذوق و شوق سے ہر شخص کے قدم چار مینار کی طرف بڑھتے نظر آ رہے ہیں۔

کئی روز قبل اس وسیع شہر اور اس کے اطراف و اکناف کے ہر گلی کوچے میں

جہاں پناہ کے حکم سے یہ منادی کردی گئی ہے کہ :-

"شہر کے وسط میں جس عظیم الشان مسجد کی تعمیر کی جانے والی ہے اُس کا سنگِ بنیاد وہی شخص رکھے گا جس کی کوئی نماز بارہ سال کی عمر کے بعد سے قضا نہ ہوئی ہو"۔

اس اعلان کے بعد سے ہر شخص روزِ مقررہ کا بے چینی سے منتظر تھا۔ اکثر قدیم طرز کے بزرگوں کو اب محسوس ہو رہا تھا کہ سلطنت قطب شاہیہ کے اس پرشکوہ پایہ تخت میں اس کے شایانِ شان مسجد موجود نہیں تھی حالانکہ بھاگ نگر کے بسانے والے پریمی بادشاہ محمد قلی نے اس امر کا التزام کیا تھا کہ اس کی محبوب بستی ہر لحاظ سے دُنیا کے بڑے سے بڑے اور شایستہ سے شایستہ شہروں پر سبقت لے جائے۔ لیکن تعجب ہے کہ جہاں اسنے چار مینار، دولت خانۂ عالی اور دار الشفا جیسی رفیع الشان اور بلند عمارتیں بنائیں، نیز سیکڑوں نفیس پاکیزہ حمّام، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کیں صرف "جامع مسجد" پر اکتفا کیا جو وسعت و بلندی کے لحاظ سے متذکرہ عمارتوں کی صف میں شریک نہیں کی جاسکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ سلطان محمد قلی زیادہ تر فنون لطیفہ اور شعر و سخن کا دل دادہ تھا۔ اس کو موجودہ جہاں پناہ سلطان محمد قطب شاہ کی طرح مذہب و فلسفہ سے دلچسپی نہ تھی اس کی زندگی عشق و محبت کی سرگوشیوں میں گزر گئی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ خود شہر حیدرآباد اور اس کی ساری عظمت اسی عاشق مزاج جاں باز کی بے نظیر محبت اور وارفتگی کی لازوال یادگار ہے۔

چار مینار کے پہلو کا وہ میدان جہاں یہ مسجد بنائی جارہی ہے انسانوں کا ایک ذخّار سمندر معلوم ہو رہا ہے۔ اس کے وسط میں ایک وسیع عمارت کی عمیق بنیادوں کے بیچوں بیچ ایک وسیع شامیانہ کے نیچے زرق برق لباس پہنے ہوئے امیروں اور شاہی

خدمت گاروں کی دو رویہ قطاریں کھڑی ہیں یہ سب جواں بخت اور جواں سال بادشاہ کی آمد آمد کے منتظر ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے سارے مجمع کی نظریں اس سڑک کی طرف اُٹھ جاتی ہیں جو دولت خانہ عالی سے چار مینار کی طرف نکلتی ہے گردنوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ رنگ برنگ کے شملوں اور رومالوں کا فضائے بسیط میں لہراتا سمندر کی مضطرب لہروں کا منظر پیش کر رہا ہے۔

صبح دس بجنے کے قریب آخر کار شاہی نشان کا ہاتھی چار مینار کے پہلو میں پہنچ گیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجمع کا سارا شور و شغب کافور ہو گیا۔ اب ہر ایک کی یہی کوشش ہے کہ ظل اللہ کو دیکھنے کی سعادت حاصل کرے کیونکہ اس کو یقین ہے کہ اگر بادشاہ سلامت کا چہرہ نظر آجائے تو سال بھر کی کلفت دور ہو جائے۔

نشان کے ہاتھی کے بعد متعدد ہاتھی نظر آئے اور سو ڈیڑھ سو سوار پُر رعب لباس پہنے تاتاری گھوڑوں پر سوار تیر کمان لئے، اور ڈاب میں تلواریں لٹکائے ڈھالیں پیٹھ پر جمائے قطار در قطار چار مینار کے نیچے پہنچ کر صف باندھے کھڑے ہو گئے۔ ان کے بعد ایک دستہ سواروں کا قرنا پھونکتا اور نفیریاں بجاتا ہوا میدان میں داخل ہوتا ہے۔ اُس کی آمد آمد کے ساتھ مجمع میں ایک وسیع راستہ کھل جاتا ہے۔ اس وقت دیکھنے والوں نے حضرت موسیٰ کے ہزاروں سال قبل کے معجزہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ طوفان بدوش دریائے نیل میں بنی اسرائیل کے گزر جانے کے لئے کس طرح راستہ بن گیا تھا۔ بادشاہ سلامت گھوڑے پر سوار ہیں اور پچاس ساٹھ پیادے باادب چلے آرہے ہیں۔ نقیب "ہٹو بچو نگاہ روبرو" کے نعرے لگا رہے ہیں، چوبدار نقروی عصا لئے ہوئے راستے سے مجمع کو ہٹا رہے ہیں کسی کے پاس برچھے ہیں، کسی کے ہاتھ میں مورچھل ہیں جو ظل اللہ کے دونوں طرف برابر جھل رہے ہیں۔ آفتاب گیری اور چتر بادشاہ پر سایہ فگن ہے۔

جب جہاں پناہ امیروں اور خدمت گزاروں کے جھرمٹ میں شامیانے کے نیچے پہنچ جاتے ہیں تو شاہی نقیب بآوازِ بلند اعلان کرتا ہے:۔

"اعلیحضرت ظلِ سبحانی جالیسِ سریرِ سلطنت و کامرانی معدلت پناہ سلطان محمد قطب شاہ حکم فرماتے ہیں کہ شرفا و نجبائے شہر میں سے جو یہاں جمع ہیں بارہ[12] سال کی عمر سے اب تک جس نے ایک وقت کی بھی نماز قضا نہ کی ہو براہ کرم وہ آگے بڑھے اور خانۂ خدا کا سنگِ بنیاد اپنے ہاتھ سے رکھے۔"

مجمع پر سکون چھایا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان مرمر کی مورتیں بن گئے ہیں۔ سانس لینے کی آواز تک نہیں سنائی دیتی۔ چند لمحوں کے بعد نقیب نے پھر اس حکم کو دہرایا۔ مجمع میں ہر ایک شخص دوسرے کی طرف دیکھنے لگتا اور مجمع کا مجمع اس خوش بخت کی زیارت کا منتظر ہے جو اس سعادت سے مشرف ہونے والا ہے۔ کہیں ہل چل نہیں۔ ایک محلے کے رہنے والے دوسرے محلے والوں کو اور ایک گروہ دوسرے گروہ کو دیکھ رہا ہے۔ گویا سب کے سب ایک زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں کسی کو حرکت کرنے کی اجازت ہی نہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد شاہی نقیب تیسری مرتبہ ذرا وضاحت کے ساتھ رک رک کر مجمع کو سمجھاتا ہے اور بدقت تمام مجمع کا یہ سکوت ٹوٹتا ہے۔ دو شخص آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔ جن میں سے ایک شرعی قسم کھانے کے بعد عرض کرتا ہے۔

"بارہ سال کی عمر سے اب تک کوئی نماز قضا نہیں ہوئی البتہ ایک روز صبح کی نماز میں دوسری رکعت پڑھ رہا تھا کہ آفتاب طلوع ہو گیا۔"

دوسرے شخص نے بھی قسم کھا کر کہا کہ:۔

اگرچہ ایک دفعہ صبح کی نماز وقت پر پڑھی تھی لیکن طلوعِ آفتاب کا

وقت قریب ہوگیا تھا اس لئے رفعِ شبہ کے لئے اعادہ کیا تھا کبھی
نماز قضا نہیں ہوئی"۔

ان دونوں کے بیان سے عوام میں ایک ہلچل سی مچ رہی تھی کہ سلطان محمد خود بڑھتا ہے اور شرعی قسموں کے بعد کہتا ہے کہ :۔

"اُس خدائے یگانہ و بزرگ کی قوت و دبدبہ کی قسم ہے جس کے گھر کی بنیاد ڈال رہا ہوں میری بارہ[۱۲] سال کی عمر سے اس وقت تک پنج وقتہ نماز کسی وقت قضا نہیں ہوئی ہے اور اسی طرح میری تہجّد کی نماز بھی کبھی قضا نہیں ہوئی"۔

یہ کہہ کر سلطان محمّد بنیاد کا پتھر خود اپنے سر پر اٹھا لیتا ہے اور اپنے ہاتھوں سے مسجد کی بنیاد میں رکھ کر اُس کی تعمیر کا آغاز کرتا ہے اور وہ دونوں سعادت مند زرو جواہر سے بھری ہوئی کشتیاں انعام میں حاصل کر کے مجمع میں شریک ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کھویا ہُوا چاند

سنہ ۱۰۳۶ھ

بھاگ نگر کے بسانے والوں نے موسیٰ ندی کی طغیانیوں کا سدِّباب کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ لیکن شاید قدرت کی طرف سے طغیانیوں کی صورت میں آئے دن ایسے سامان مہیا کر دئے جاتے تھے کہ اس پریم نگری کے باشندے اپنی ہمہ گیر فتحمندیوں، دولت و ثروت اور عیش و عشرت کی گھڑیوں میں یادِ خدا سے غافل نہ ہونے پائیں۔

قطب شاہی دور میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب موسیٰ ندی کی طوفان خیز موجیں شہر کی سنگ بستہ دیواروں، سرسبز و شاداب باغوں کی آراستہ روشوں، لبِ ساحل کی پُرفضا بارہ دریوں اور محلّات کے معمور تہ خانوں کو اپنے دست بُرد سے متاثر نہ کرتی ہوں اور واقعہ یہ ہے کہ ہر طغیانی کنارِ موسیٰ کے بسنے والوں میں زندگی اور عمل کی خوابیدہ قوتوں کے لئے تازیانہ کا کام کر جاتی تھی۔ انہی طغیانیوں نے مغلوں کے دست تعدی سے ایک عرصے تک گولکنڈہ کے آخری سرفروشوں کو بچائے رکھا اور اسی طغیانی کی وجہ سے گولکنڈہ اور موضع چچلم کے درمیان ایک عالیشان پل بنایا گیا جو شہر حیدرآباد کی تعمیر کا سنگ بنیاد ثابت ہوا۔ یہی طغیانی آج ایک ایسے رسم کے آغاز کا بھی باعث بن رہی ہے جو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اب تک جاری ہے اور حیدرآباد کی مخصوص رونق کا سامان ہے۔

۲

نوعمر عبداللہ مرزا کو تخت نشین ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ رودِ موسیٰ کے

دامن نشینوں نے ابھی ابھی بقر عید کی خوشیاں منائی تھیں اور اس سال اس کثرت سے بکروں کی قربانیاں ہوئی تھیں کہ بعض بعض مقامات خاص کر ساحل کے باغات میں ندی کا پانی بکروں کے خون سے ایک آدھ روز تک سُرخی مائل نظر آتا رہا۔ کئی دن تک امیروں کے باغ جو کنارِ موسیٰ واقع تھے۔ گوشت کی دعوتوں اور بے فکروں کے جلسوں سے آباد رہے اور ابھی اِن سرمستیوں کا نشہ اُترنے بھی نہیں پایا تھا کہ دار السلطنت میں ایک تشویش ناک حادثہ رونما ہو گیا۔ عید کے چند روز بعد ہی سے موسیٰ ندی کا پانی یکایک غیر معمولی رفتار سے بڑھتا گیا اور یہ اس ندی کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ لیکن اس موقع پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ندی کا دیوتا ان جلسوں کی آلودگیوں اور خون کی کثرت کی وجہ سے خشمگیں ہو گیا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے دامن سے ان دھبوں کو دھوڈالے۔ مگر ندی یا اس کے دیوتا کی یہ آشفتگی بھاگ نگر کے باشندوں کے لئے نئی نہ تھی اور اِس دفعہ بھی وہ اس کو محسوس تک نہ کرتے اگر اس کی وجہ سے ان کے نوعمر بادشاہ کی جان خطرہ میں نہ پڑ جاتی۔

۳

موسیٰ ندی کے مشہور آفاق پل کے قریب "کوچہ صورت مورت" دُور دُور تک مشہور تک تھا۔ شہر بھاگ نگر کا کوئی سیاح اور نو وارد ایسا نہ ہوتا جو اپنی فرصت کے اوقات میں قلعہ گولکنڈہ کی شمال مشرقی فصیل کے کنارے ہتیان کے درخت اور موسیٰ ندی کے پل اور حسینی علم کے درمیان کوچہ صورت مورت کی سیر کے لئے نہ آتا۔ اول الذکر درخت اگرچہ بعد کو نئے قلعہ کی فصیلوں میں محصور ہو گیا مگر اس کی عظمت و ندرت وہاں بھی اس کے دیکھنے والوں کو کشاں کشاں بلاتی رہی یہ عجیب و غریب درخت کئی امور کے لحاظ سے عجوبہ اور قابل دید ہے۔ اس کا پیڑ بالکل پہاڑ نما ہے۔ اس کے رنگ اور وضع قطع کو دیکھکر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ جماد نہیں نبات ہے۔ یہ پیڑ ایک سو سولہ فٹ چوڑا ہے اگر اس کے

ایک طرف کھڑے ہوکر بآواز بلند گفتگو کی جائے تو دوسری طرف سنائی نہیں دے سکتی۔
اس کے پوست پر ہاتھی کی کھال کی طرح جھریاں پڑی ہوئی ہیں اور جہاں جہاں سے شاخیں
نکلی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھی سونڈ اٹھائے کھڑے ہیں۔ اس پیڑ کے اندر پچاس فٹ
مربع رقبہ کا ایک کھوکھلا حصّہ ہے جس کی وضع بالکل گنبد کی سی ہے۔ اس نادرالوجود ہاتھی نما
درخت کی طرح شاہی ہاتھیوں کے رہنے کی جگہ "کوچہ صورت مورت" بھی کچھ کم قابل دید نہ تھی
صورت ایک ہاتھی کا، مورت دوسرے ہاتھی کا نام تھا۔ گولکنڈہ کے سیکڑوں ہاتھیوں میں سے
یہی دو[2] شاہی سواری کے لئے منتخب کئے گئے تھے اور خوبصورتی و تربیت میں ہر طرح سے
ممتاز تھے۔ اُن کے سونے چاندی کے قیمتی اور مُکلّف سازوسامان کی تمام ہندوستان میں
شہرت تھی۔

۴

ان ہاتھیوں میں سے ایک ہاتھی مورت پر جس کا ہودج اور پاکھر اور جھول وغیرہ
زردوز اور طلائی تھے عیدالضحیٰ کی تقریب منانے کے بعد سلطان عبداللہ ندی محل سے
قلعہ گولکنڈہ کو جا رہا تھا حسینی علم اور کوچہ صورت مورت سے گزر کر پُل کے دروازہ پر پہنچا
تھا کہ موسیٰ ندی کی سرکش موجیں اُس کے پاؤں میں اٹکھیلیاں کرنے لگیں۔ مورت کو غالباً
یہ بے باکی پسند نہ آئی۔ وہ نہایت سنجیدگی سے ایک جگہ ٹھہر گیا اور شوخ و گستاخ دخترانِ
رودِ موسیٰ کی بدتمیزیوں پر حیران تھا۔ مہاوت مورت کے غیر معمولی وقار اور غرور سے ناواقف
نہ تھا۔ لیکن بادشاہ سلامت کی سواری کا اس طرح رُک جانا بھی تو آدابِ شاہی کے خلاف ہے!
اس نے مورت کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مہاوت
پریشان تھا کہ مورت پتھر کی مورت تو نہیں بن گیا۔ اُس نے ایسی عدول حکمی ابتک نہیں کی
تھی۔ مجبور ہوکر مہاوت نے انکس سے کام لینا چاہا۔ مورت کے غصّہ میں اضافہ ہوتا گیا۔

اس کے اس کوہستانی سکوت پر جلوس کے گھوڑے اور خدمت گار سبھوں نے اس کو اکسانا شروع کیا۔ ادھر سے طوفانی موجوں کی مسلسل سرکشی، ادھر سے تیز انکس کی نیش زنی، اور گھوڑوں کے ٹاپوں کا شور۔ یہ تمام ہنگامے مورت جیسے مغرور ہاتھی کی پریشانی کیلئے کچھ کم نہ تھے۔ اس کا جذبۂ خودداری بری طرح مجروح ہو رہا تھا وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے اس کے فلک شکوہ جسم میں بجلی کی سی تڑپ پیدا ہو گئی اس نے سونڈ کی ایک حرکت میں غریب مہاوت جیسے بارگراں کو زمین پر گرا کر پاؤں سے کچل ڈالا۔ اب کیا تھا سارے مجمع پر ہیبت چھا گئی۔ جان نثاروں نے بادشاہ کی جان بچانے کی خاطر ہر طرح کوشش کی۔ مگر ان کی ہر حرکت مورت کے سمند ناز پر تازیانے کا کام کر رہی تھی۔ اس کشمکش میں دو تین غریب رہرو بھی کچل گئے اور مورت بے تحاشا جنگل کی طرف بھاگ نکلا۔

تمام شہر میں ایک ہلچل مچ گئی کہ ہاتھی جس پر سلطان عبداللہ سوار ہیں جنگل کی طرف بھاگ گیا ہے۔ قلعہ میں بادشاہ کی ماں حیات بخشی بیگم صاحبہ کو اطلاع ہوئی تمام محلات میں کہرام مچ گیا۔ کسی کے حواس ٹھکانے نہ رہے۔ دودمانِ قطب شاہی کا واحد چشم و چراغ اس طرح بے یار و مددگار ایک مست ہاتھی کے بس میں۔ معلوم نہیں زندہ بھی ہے یا اس کا بھی وہی حشر ہوا جو مہاوت کا ہوا۔

دارالسلطنت کی تمام فوجیں ہاتھی کے ڈھونڈنے کے لئے بھاگ نگر کی وادی کا چپہ چپہ، اطراف و اکناف کی پہاڑیوں کی ایک ایک چٹان، اور درختوں کا پتہ پتہ چھان ڈالتی ہیں۔ بظاہر اس کے سوا کوئی اور خیال نہ تھا کہ مورت غائب ہو گیا۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے صبح سے شام ہو گئی مگر لاحاصل۔ محلات میں فاقہ پر فاقہ ہو رہا ہے اور ہر ایک کی زبان پر ہے کہ "شاہزادہ صبح سے بھوکا ہے۔" غم دیدہ ماں نے خیر و خیرات کے

دروازے کھول دئے ہیں۔ شاہی باورچیخانے میں جو کچھ پکتا غریبوں، محتاجوں اور فقیروں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ہر چھوٹا بڑا شہزادے کے لئے دست بدعا ہے۔

مسجدوں میں یہی ذکر، خانقاہوں میں یہی تذکرہ، بازاروں میں سناٹا سا چھایا ہوا ہے۔ شاہی نقیب تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ملکۂ عالم کے انعام و اکرام کا اعلان کرنے کے لئے قلعہ سے چوک میں آتے ہیں اور عوام کو شاہی ہاتھی پکڑ لانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ آدھا شہر جنگلوں میں مصروف تلاش ہے۔ ایک دن اور ایک رات اسی عالم میں گزر گئی۔ دوسرے دن ذالحجہ کی اٹھائیسویں تاریخ کا آفتاب طلوع ہوا ہے اور ملکہ صدقے میں ہزاروں جانور چھڑا رہی ہیں، مٹھیوں سے جواہرات صدقے میں تقسیم ہو رہا ہے۔

"رات تمام شہزادہ پر کیا گزری ہوگی" ایک خواص نے آہ سرد بھر کر کہا۔

"عبداللہ میرزا اگر تیرے دشمنوں کا بال بھی بیکا ہوا تو میں زندہ درگور ہو جاؤں گی" فرقت زدہ ماں کی زبان پر بار بار یہی الفاظ ہیں اور آنسو ہیں کہ تھمتے نہیں۔ رات تمام وہ محل کے جھروکے سے قلعہ کے جلوخانہ اور بھاگ نگر کی طرف نظر جمائے رہیں کہ شاید اب کوئی خبر آئے۔ دنیا بھر کے ٹونے اور ٹوٹکے کئے گئے۔ عاملوں اور رمالوں کی بن آئی۔ آخر جب تمام رات آنکھوں آنکھوں میں کٹ گئی اور چارمینار کے پیچھے سے جب آفتاب کی کرنیں طلوع ہوتی نظر آئیں تو ملکۂ عالم نے حکم دیا کہ:۔

> "قلعہ اور بھاگ نگر کے اطراف دور دور تک درختوں کی شاخوں سے جگہ جگہ آب خاصہ کی صراحیاں اور کھانے کے توشہ دان لٹکا دئے جائیں۔ شاید ہاتھی اس طرف سے گزرے اور یہ سامان شہزادے کے کام آئے۔"

۲۹ ذی الحجہ کو حیات نگر سے اطلاع آئی کہ رات بن ہاتھی اس طرف سے گزرا

گاؤں والوں نے تعاقب کیا دو چار آدمی روندے گئے مگر ہاتھی قابو میں نہ آنا تھا نہ آیا بے تحاشا بھاگ گیا۔

اسی عالمِ تشویش میں تین چار دن گزر جاتے ہیں۔ ملکہ جھروکے سے باہر کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھی ہیں کہ آسمان پر محرم کا چاند نظر آیا۔ اس کو دیکھتے ہی ملکہ کو اپنا کھویا ہوا چاند یاد آگیا۔ وہ بے اختیار رونے لگیں لیکن یکایک اُن کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ اپنا دردِ دل جگر بند فاطمہ سیدالشہدا حضرت امام حسینؑ کی بارگاہ میں کیوں نہ عرض کروں کیوں نہ منت مانوں۔ فوراً ان کی زبان سے بے اختیار نکلا:۔

اے امام شہید مظلوم آپ کی اس لونڈی کے جگر کا ٹکڑا اگر صحت و سلامتی اور خیر و خوبی کے ساتھ آملے تو دولت خانہ شاہی میں داخل ہونے سے قبل چالیس من سونے کی زنجیر بنواؤں گی اور مست ہاتھی کے پاؤں میں لنگر کر کے آپ کے غلام سلطان عبداللہ کی کمر میں باندھ کر قلعہ گولکنڈہ سے مکان حسینی علم تک پا بپیادہ لے جاؤں گی اور وہاں فقراء و مساکین و سادات و علماء و فضلاء و ارباب احتیاج میں تقسیم کر دوں گی"۔

دوسرے روز صبح سویرے ملکہ کو دور سے ایک آواز سنائی دی۔ وہ دوڑی ہوئی جھروکے کی طرف آئیں۔ دیکھا کہ خلق اللہ کا ایک ہجوم ہے کہ قلعہ کے دروازے کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے اتنے میں فصیل کی طرف صبا رفتار گھوڑے دوڑتے آئے اور جھروکے کے نیچے پہنچ کر شاہی خدام کو آواز دی کہ

"حضرت ماں صاحبہ قبلۂ جہانیان کی خدمت میں مبارکباد عرض کریں کہ صاحب عالم حضرت سلطان عبداللہ قطب شاہ بفضل الٰہی بہ صحت و عافیت

تشریف لا رہے ہیں ۔ ہاتھی کی مستی اُتر چکی ہے اور وہ حسب سابق مطیع ہو گیا ہے"۔

ملکہ نے کہلا بھیجا کہ "سلطان کو بالاحصار کے اندر نہ آنے دو۔ دروازہ ہی پر روک دو" اس اثناء میں مورت بالاحصار کے دروازہ تک پہنچ گیا۔ ملکہ نے اپنے جگر گوشے کے یہاں اندر سے کہلا بھیجا کہ :۔

"زنہار اندر قدم نہ رکھنا"

اسی وقت سیکڑوں سُنار جمع ہو گئے ۔ چالیس من سونے کی ایک زنجیر بنوائی گئی۔ چالیس من پختہ مصری کا شربت بھی تیار کیا گیا۔ قلعہ سے دروازہ حسینی علم تک سُرخ مخمل کا فرش بچھ گیا اور سلطان عبد اللہ برہنہ پا کمر میں زنجیر بندھی ہوئی حسینی علم تک پیدل روانہ ہوا اور وہ طلائی زنجیر اور شربتِ قند و گلاب وہاں غربا میں تقسیم کر دیا گیا۔

اُس وقت سے اب تک ہر سال محرّم میں عقیدت مندوں کی طرف سے سیکڑوں لنگر حسینی علم میں داخل ہوتے ہیں اور حیات بخشی بیگم ماں صاحبہ کی یہ منت بطریق اراد ہمیشہ جاری رہے گی ۔

ننھّی سانولی

سنہ ۱۰۳۰ھ

ملکہ کی خدمت میں ہمیشہ خوش سلیقہ اور خوش جمال امیرزادیاں رہا کرتی تھیں۔ طبقۂ نسواں کے فلاح و بہبود سے ان کو خاص دلچسپی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی سلطنت کے امیروں اور راجاؤں کی لڑکیوں کو اپنے خانہ باغ میں شہزادیوں کی طرح پرورش کرتی تھیں۔ ایک دفعہ قطب شاہی قلمرو کا بہت بڑا علاقہ قحط سے متاثر ہوگیا۔ اور غریب رعایا اس درجہ تباہ ہوگئی کہ اس کو اپنی عزیز اولادتک فروخت کردینی پڑی۔ جب یہ بد قسمت بچے اضلاع اور دیہات سے گولکنڈہ اور بھاگ نگر میں لائے گئے تو رحمدل پادشاہ بیگم کو ان کی حالت زار کا علم ہوا اور انھوں نے حکم دیا کہ قحط زدہ لڑکیاں شاہی محل میں پہنچادی جائیں اور آیندہ جو شخص اپنی لڑکی فروخت کرنا چاہتا ہو وہ اُس کو سیدھا گولکنڈہ کے بالاحصار میں لے آئے اور وہاں "دلہن دروازہ" کے پہرہ داروں کو تاکید کردی گئی تھی کہ ہر لڑکی کے والدین کو منہ مانگی قیمت ادا کرکے لڑکی کو حمام خانہ میں روانہ کردیں۔

ملکہ نہیں چاہتی تھیں کہ یہ غریب لڑکیاں عوام کے یہاں لونڈیوں کی طرح پرورش پائیں، اور ہمیشہ کے لئے مصائب کا شکار بنی رہیں۔ وہ خود بنفس نفیس ان پر نظر رکھتیں اور مغلانیوں کو ہدایتیں کرتیں کہ نوشت و خواند کی تعلیم کے علاوہ ہر لڑکی کو اس کے شوق اور فطری رجحان کے مطابق کام سکھائیں۔ ان ہی میں سے ایک غریب لڑکی اپنے شائستہ اطوار، شگفتگی طبع، اور حسنِ ملیح کی وجہ سے ملکہ کی ایسی منظور نظر بن گئی کہ مغلانیوں کی نگرانی سے نکل کر خانہ باغ میں ملکہ کی پیشی میں آگئی اور ملکہ نے امیرزادیوں کے زمرے میں اس کو بھی شریک کرلیا۔ رنگ روپ

اور وضع قطع کے لحاظ سے اس کو ننھی سانولی کا خطاب بھی عنایت کیا گیا تھا۔

ملکہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ میں نے اس لڑکی کو تحت ثریٰ سے نکال کر عرش معلیٰ پر پہنچا دیا ہے مگر ننھی سانولی محسوس کر رہی تھی کہ وہ جنت سے نکال کر دوزخ میں ڈال دی گئی ہے۔ وہ پہلے آزاد تھی اور اب طرح طرح کی قیدو بند میں جکڑ گئی تھی۔ وہ پہلے قحط زدہ لڑکیوں کے دلوں پر ایک ملکہ کی طرح حکمران تھی۔ لیکن اب صحبت ناجنس نے اس کی ساری شگفتگی کو ملیامیٹ کر دیا تھا۔ خانہ باغ کی امیرزادیاں اس کو ایک قحط زدہ لڑکی سمجھ کر ملکہ کی غیر موجودگی میں اس سے دُور دُور رہتیں۔ گویا وہ نجس و ناپاک تھی۔

ننھی سانولی نے اپنی عمر میں پہلی دفعہ معلوم کیا کہ اگرچہ انسان بہ حیثیت انسان سب برابر ہیں، لیکن ان میں بھی امیری اور غریبی کی وجہ سے بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی پہلی کی ہجولیاں جانتی بھی نہ تھیں کہ اُن میں سے ایک شریف ہے اور ایک رذیل۔ اس آزاد اور معصوم فضا میں کئی سال پرورش پانے کے بعد ننھی سانولی نے خانہ باغ میں قدم رکھا تو اس کو ایک نئی دنیا نظر آئی۔

خانہ باغ کی ہمجولیوں کو ابتدا میں دور دور دیکھ کر اس نے خیال کیا کہ یہ اس لئے مجھ سے نہیں ملنا چاہتی ہیں کہ میں نئی نئی آئی ہوں۔ لیکن وہ جیسے جیسے پرانی ہوتی گئی اس کو محسوس ہوتا گیا کہ خانہ باغ کی امیرزادیوں اور اس کے درمیان جدائی کا جو خلیج حایل ہے وہ روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی کبیدہ خاطری بڑھنے لگی، وہ بار بار اپنے ماں باپ کے غریب ہونے پر افسوس کرتی، غریبی اور امارت کسی کے بس کی چیز نہیں۔ لیکن یہ واقعہ کہ اس کو ماں باپ نے فروخت کر دیا ہے اُس کے لئے سخت تکلیف کا باعث تھا اور جیسا جیسا ہوش بڑھتا گیا یہ احساس بھی بڑھتا گیا۔

ننھی سانولی کی شگفتہ طبیعت کی تدریجی تبدیلی اور خاموشی نے ملکہ کو اس کی طرف

اور زیادہ مائل کر دیا۔ وہ ہر بات میں اس کا لحاظ رکھنے لگیں لیکن جس قدر ملکہ کی مہربانیاں اس کے حال پر زیادہ ہوتیں اتنا ہی زیادہ امیرزادیاں اس سے کشیدہ خاطر ہوتی جاتیں اور اس کی خوش قسمتی پر حسد کرنے لگتیں حاسدوں کی نگاہوں میں خوبیاں بھی ہمیشہ معائب ہی نظر آتی ہیں۔ وہ کہتی تھیں کہ ننھی سانولی نے عمداً ایسا حال بنا رکھا ہے تاکہ پادشاہ بیگم اس کو چاہنے لگیں۔ ان کے بے پناہ طعنوں کا جواب دینا آسان نہ تھا۔ پہلے پہل تو اس غریب نے اپنی شگفتہ مزاجی کے اقتضا سے حاضر جوابی سے کام لیا لیکن جب دیکھا کہ ہر ایک اس کی مخالفت پر کمربستہ ہے تو خاموش رہنے لگی۔ خاموشی بھی جواب جاہلاں سمجھی گئی۔ اور سبھوں نے چھیڑنا شروع کیا۔

ننھی سانولی کے پاس صبر و شکیب کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ ان کی سب شرارتوں سے زیادہ ان کی منافقت پر حیرت کرتی تھی کہ بادشاہ بیگم کی موجودگی میں تو وہ اس سے اس طرح بات چیت 'خلا ملا' بلکہ خوشامد کرتیں کہ ملکہ کو خیال بھی نہ ہونے پاتا کہ ان کے آپس میں چشمک ہے۔

گرمی کے موسم میں یہ سب امیرزادیاں محل کی چاندنی پر پانی سے کھیلا کرتی تھیں۔ گولکنڈہ کے شاہی محل پانچ پانچ چھے چھے منزلہ ہوتے تھے اور ہر منزل میں پانی کا خاص انتظام تھا۔ ہر جگہ حوض بنے ہوتے اور خاص کر سب سے بالائی منزل کی چاندنی پر باغوں کی روشوں کی طرح نقشے ڈالے جاتے تھے۔ اور ان میں جگہ جگہ پھولوں کی کیاریاں اور ان کے درمیان صاف و شفاف پانی سے لبالب چھوٹے چھوٹے حوض ہوتے۔ اس طرح ہر بڑی چاندنی پر آٹھ دس حوض ضرور ہوتے اور ان میں نہایت خوش وضع فوارے اچھلتے رہتے۔ غرض بالاحصار کے محلات کی رہنے والیوں کے لئے سر بفلک فصیلوں اور عمیق خندقوں کے اندر بھی سیر و تفریح کے کشادہ مقام اور سامان فراہم کر دئے گئے تھے۔ ان حوضوں کے

اطراف موسم گرما میں پری رویوں کے جھرمٹ گھٹے رہتے اور طرح طرح کی خوش فعلیاں!

ایک روز پانی اچھالتے اچھالتے نہ معلوم خانہ باغ کی امیرزادیوں کو کیا سوجھی کہ انھوں نے ہر طرف سے ننھی سانولی پر پانی پھینکنا شروع کیا۔ شاید پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ ان میں سے دو دو تین تین ایک ایک حوض پر کھڑی ہوگئیں اور جہاں ایک کی زد سے بچنے کے لئے ننھی سانولی دوسری طرف ڈورتی ادہر سے بھی پانی کی بوچھاڑ آنے لگتی۔ اسی طرح وہ بھاگتی پھری مگر کہیں پناہ نہ ملی۔ اس بھاگ ڈور میں وہ پانی میں شرابور ہوگئی تھی اور چونکہ ساری چاندنی جل تھل بن گئی تھی ایک جگہ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ بری طرح سے گرپڑی۔ ہجولیوں نے قہقہے مار کر ہنسنا شروع کیا۔ ان کی آواز نے قریب کی چاندنی پر پتنگ اڑانے والے نوجوان شہزادہ کو ان کی طرف متوجہ کردیا۔ اس نے دیوار پر سے جھانک کر دیکھا۔ ننھی سانولی کا غصہ سے تمتمایا ہوا چہرہ، بھیگے کپڑوں میں سے اس کے سڈول جسم کے خطوط منحنی کا متناسب اتار چڑھاؤ، اور اس کا بے ساختگی کے ساتھ اپنے جسم سے چمٹے ہوئے کپڑوں کو جھٹکتے اور جسم سے علحدہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہونا سرمست شباب شہزادہ کے رگ و ریشہ میں ایک برقی رو دوڑانے کے لئے کافی تھا۔ وہ فوراً دیوار پھاند کر مہ جبینوں کے جھرمٹ سے گذرتا ہوا ننھی سانولی تک پہنچ گیا۔

ننھی سانولی نے جب دیکھا کہ شہزادہ نے اس عالم میں اس کو دیکھ لیا ہے اور اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے تو اس کے حواس ٹھکانے نہ رہے اور وہ سنبھلتے سنبھلتے پھر گر گئی۔ شہزادہ اس کو سنبھالنے کے لئے بے اختیار اس کی طرف لپکا اور فوراً گود میں اٹھالیا۔ اس وقت ننھی سانولی کا دل کچھ تو اضطراب اور کچھ شرم سے دھڑک رہا تھا۔ وہ منہ چھپا کر بھاگ جانا چاہتی تھی۔ شہزادہ نے بے خیالی کے عالم میں اس کو گود میں اٹھا تو لیا مگر اب سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ اِس بسملِ حجاب کو کہاں لیجائے۔ ملکہ کا خوف، وہ کا

خیال، اور ایک غیر محرم نوجوان لڑکی کی قربت۔ اس نے فوراً اس کو وہیں چھوڑ دیا اور سامنے کی دیوار پھاند کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ننھی سانولی نے مڑ کر دیکھا تو نہ شاہزادہ نظر آیا اور نہ شریر امرازادیاں۔ وہ سب شہزادہ کو دیکھ کر اِدھر اُدھر چھپ گئی تھیں ننھی سانولی نے محسوس کیا کہ ع

بجلی ایک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا!

کاش میں شہزادہ کی اِس ہمدردی اور اعانت کا کم سے کم شکریہ ہی ادا کر سکتی۔

ملکہ کو بہت جلد اس واقعہ کی خبر ہو گئی۔ امیر زادیوں نے کچھ ایسا قصّہ گھڑا کہ سارا قصور ننھی سانولی ہی کا معلوم ہوتا تھا۔ ملکہ کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ شریف طبیعت اور سنجیدہ مزاج لڑکی نوجوان شہزادہ کو پتنگ اڑاتا دیکھ کر ایسی حرکتیں کرے گی کہ شہزادہ اس کی طرف مائل ہو جائے اور اس کو اٹھانے کے لئے دوڑے۔ یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کی پاداش میں جتنی سخت سزا دیجاتی کم تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ بادشاہ اپنے چہیتے بھتیجے شہزادہ سلطان مرزا کی پرورش و تربیت خاص شاہی محل میں اپنی ذاتی نگرانی میں کر رہے ہیں کیونکہ ان کے اولاد نرینہ نہ تھی اور یہی خوش بخت شہزادہ ان کا جانشین قرار دیا گیا تھا اور اسی سے اِن کی اکلوتی لڑکی حیات بخشی بیگم منسوب تھیں۔ غرض ملکہ اور بادشاہ کے واحد نورچشم کے بننے والے دولہا اور قطب شاہی تخت و تاج کے یکتا وارث کے ساتھ اس قسم کے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش قابل معافی نہیں ہو سکتی تھی۔

ملکہ نے ننھی سانولی کو خلوت میں بلا کر اصل واقعہ دریافت کیا۔ اس نے ہر بات صاف صاف کہدی۔ ملکہ امرازادیوں کی اس جسارت اور شرارت سے بے حد ناخوش ہوئیں۔ انھوں نے ننھی سانولی کو بھی ڈانٹا کہ جب اس کے ساتھ امیر زادیوں کا برتاؤ پسندیدہ نہ تھا تو ملکہ کو اس سے واقف کیوں نہ کیا۔ اسی وقت اس نے تمام امیرزادیوں پر خفگی کا

اظہار کیا اور آئندہ سے ننھی سانولی کے ساتھ مل جل کر رہنے کی تاکید کی۔
ملکہ اور امرازادیاں سب یہ سمجھ رہی تھیں کہ ایک اتفاقی واقعہ تھا جو گذر گیا۔ مگر شہزادہ اور ننھی سانولی دونوں کے دلوں میں ایک خلش باقی رہ گئی جو مٹائے نہ مٹ سکتی تھی۔ سرمستِ شباب شہزادہ کو پہلی دفعہ صنفِ نازک سے اس قدر قرب حاصل کرنے کا موقع ملا تھا۔ نوعمر ننھی سانولی کے دل کی دھڑکن کسی طرح کم نہ ہوتی تھی۔ شہزادہ نے جب اس کو گود میں اٹھالیا تھا اور دونوں کے جسم ایک دوسرے سے ملے تھے تو ایک بجلی تھی جو دونوں جسموں میں ایک ساتھ سرایت کر گئی اور دونوں کے جذبات کو بیدار کر دیا۔ شہزادہ کو تشویش تھی کہ کہیں غریب لڑکی پانی میں بھیگ کر بیمار نہ پڑ جائے۔ ننھی سانولی پریشان تھی کہ کہیں اس کے ساتھ ہمدردی کرنے کی وجہ سے ملکہ کا شہزادہ پر عتاب نہ ہو۔ وہ اکثر خواب میں اپنے آپ کو کہیں نہ کہیں گرتی ہوئی دیکھتی اور یہ دیکھ کر نیند سے چونک پڑتی کہ مہربان شہزادہ اس کو اٹھانے کے لئے اس کے قریب آگیا ہے۔ جب نیند سے بیدار ہوتی تو تمام رات خوف و دہشت سے تنہائی میں گذارتی۔ اس کی حرمان نصیبی کی انتہا نہ تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ گذرا ہوا سماں ہر وقت آنکھوں کے سامنے تھا۔ عالم بیداری ہو یا عالم خواب وہی واقعہ صورت بدل بدل کر خیال میں، دماغ میں، چکر لگا رہا تھا۔
ایک روز محل کی ایک اصیل (خادمہ) نے ننھی سانولی کو تنہا پا کر آہستہ سے کہا کہ شہزادہ سلطان مرزا نے مجھے کئی دفعہ بلا کر آپ کی خیریت اور حالات دریافت کئے ہیں۔ وہ اکثر جھروکہ کی طرف جاتے وقت خاص محل کی جالیوں میں سے جھانک جھانک کر آپ کو دیکھتے ہیں، اور جتنا زیادہ آپ نظر آتی ہیں اتنا ہی ان کا دل آپ سے ملنے اور بات چیت کرنے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے۔
ننھی سانولی کانپنے لگی۔ اس نے اصیل پر خفگی کا اظہار کیا اور کہا کہ آیندہ سے

کبھی اس قسم کی گفتگو نہ کرے۔ دوسرے روز جب وہ ملکہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے تیسری منزل کی طرف جارہی تھی مقابل کے بالاخانہ میں اس کو کسی کے چلنے کی آہٹ معلوم ہوی۔ اس نے غور سے دیکھا تو جالیوں کے پیچھے سچ مچ شہزادہ کھڑا ہوا نظر آیا۔ اب تک وہ سمجھتی تھی اس طرف دیوار ہے اور کوئی شخص اُدھر سے اِدھر دیکھ نہیں سکتا لیکن اس دیوار میں جگہ جگہ روشنی کے لئے باریک جالیاں بنی ہوی تھیں اور ایسی صنعت سے بنی ہوی تھیں کہ محل میں رہنے والوں کا خیال تک ادھر نہ جاسکتا تھا۔ اگرچہ ننھی سانولی کی دلی خواہش تھی کہ ایک دفعہ پھر شہزادہ کو دل بھر کر دیکھ لے مگر شرافت اور حجاب نے ادھر نظر ڈالنے کی اجازت نہ دی۔ وہ نیچی نظریں کی ہوی نکل گئی۔ شہزادہ کو گفتگو کا اتنا اچھا موقع ہاتھ آیا تھا مگر اس وحشت زدہ ہرن کو روکنا ممکن نہ تھا۔ اس نے ایک اور دفعہ اسی اصیل کے ذریعہ سے کہلا بھیجا کہ "اگر اب کے تم نہ ٹہروگی تو میں بیتاب ہوکر پکارنے لگوں گا' میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تمھاری زبان سے تمھاری خیریت سُن لوں اور بس"۔

ننھی سانولی سے کوئی جواب بن نہ پڑتا تھا۔ اس کی دلی آرزو بھی یہی تھی کہ شہزادہ سے گفتگو کا موقع ملے تاکہ وہ اس روز کی زحمت اور امداد کا شکریہ ادا کرسکے۔ مگر وہ اصیل کو کوئی جواب نہ دے سکی اور فوراً اپنی ہجولیوں کے جھرمٹ میں داخل ہوگئی۔ دوسرے روز پھر اسی جگہ شاہزادہ کا سامنا ہوا۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"اس روز کہیں آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔ میں آپ کے خیال میں رات بھر نہ سوسکا"۔

ننھی سانولی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا اور وہ بے تحاشا بھاگ گئی۔ نامراد شہزادہ غم و غصّہ سے بے حال ہونا گیا۔ ننھی سانولی کا

خیال اس کے دل سے نکالے نہ نکلتا تھا۔ اس کے مصاحبین ہر طرح سے اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتے مگر بے سود۔

ننھی سانولی کے لئے اب اس محل میں زندگی دشوار تھی۔ وہ عجب مخمصہ میں پڑگئی تھی۔ اس کی ہر حرکت تو شہزادہ کو نظر آجاتی تھی لیکن وہ خود اس کو صاف طور پر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس احساس نے اس میں رعنائی کے ساتھ اضطراب بھی پیدا کر دیا، پہلے وہ اپنی چال ڈھال، بناؤ سنگھار، اور لباس اور زیور سے جتنی بے پروا تھی اب اتنا ہی زیادہ ان کا خیال رکھنے لگی کیونکہ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ شہزادہ جالیوں کے پیچھے کھڑا ہو کر دیکھا کرتا ہے۔

ایک روز شہزادہ نے کہلا بھیجا کہ "اگر جالی میں سے گفتگو کرنا نہیں چاہتیں تو آج کل چاندنی راتیں ہیں اوپر بالاخانہ کی اس چھت پر آجاؤ جہاں پہلی دفعہ ملاقات نصیب ہوئی تھی" ننھی سانولی روز روز کے پیام و سلام سے بیزار ہو گئی تھی اس نے اصیل سے کہا:

"خدا کے لئے شہزادہ کو سمجھاؤ کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ صاحب عالم سے ہم کلام ہو سکوں۔ وہ میرا خیال ترک کر دیں یہ میرے اور ان کے دونوں کے لئے برا ہے۔ تعجب ہے کہ حیات بخشی بیگم جیسی حسین و جمیل شہزادی کی محبت کی جگہ ان کے دل میں میرا خیال کیوں کر سما گیا۔ میں تو کسی طرح سے ان کے لائق نہیں ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مجھ گرتی ہوئی کو اٹھانے کے لئے انھوں نے جو زحمت اٹھائی تھی اس کے لئے میں عمر بھر ان کی شکرگذار رہوں گی اور یہی قدر افزائی میرے لئے کافی ہے۔ اس کی یاد میرے دل سے کبھی محو نہ ہو سکے گی۔ میں ہمیشہ فخر و ناز کے ساتھ اس خوشگوار لمحہ کو یاد کرتی رہوں گی جب

شاہزادہ جیسی ارفع و اعلیٰ ہستی نے اپنے مبارک ہاتھوں سے مجھ آفت رسیدہ کو اٹھایا تھا اور میری قسمت کو زمین کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا تھا۔"

شہزادہ ان باتوں سے ماننے والا نہ تھا۔ اُس نے کہلا بھیجا کہ تمام رات چاندنی پر تمھارا انتظار کروں گا۔ تم یہی باتیں مجھ سے ایک دفعہ بالمشافہ کہدو۔ ممکن ہے میری تشنگی بجھ جائے اور میں پھر تمھارا خیال چھوڑ دوں۔

ننھی سانولی نماز مغرب کے بعد ہی سے بے چین تھی۔ چاندنی پر شہزادہ کے انتظار کرنے کے خیال میں اس سے کھانا بھی برابر کھایا نہ گیا۔ وہ شش و پنج میں تھی کہ شہزادہ سے ملنے کے لئے جائے یا نہ جائے۔ اس کی ہمجولیاں اگرچہ اب بھی اس سے رشک کرتی تھیں لیکن ملکہ کی تنبیہ کے بعد سے فضا ہی کچھ بدل گئی تھی اور خود ننھی سانولی کی طبیعت اور شریف النفسی نے اب ان تمام کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ پریشان تھیں کہ آج ان کی غریب سہیلی نہ معلوم کیوں اتنی بے قرار اور گم صم ہے۔ ہر ایک نے اس سے دریافت کیا اور کچھ کھلانے کی کوشش کی مگر ان کی ہمدردیاں اس فرقت زدہ کی پریشانی میں اضافہ ہی کا باعث ہوئیں۔

سرِشام ہی سے اس کا چاہنے والا شاہزادہ اس کے انتظار میں چاندنی پر ٹہل رہا تھا۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ اس کی محبوبہ کی خواب گاہ کدھر ہے ورنہ وہ ضرور وہاں تک پہنچ جاتا۔ ادھر خود ننھی سانولی اپنے بستر پر ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اس کو کسی کروٹ چین نہ آتا تھا۔ وہ کئی بار شہزادہ کے خیال سے اٹھ گئی اور ایک دفعہ تو سیڑھیوں تک پہنچ گئی لیکن چڑھنے کی ہمت نہ ہوی۔

دوسرے دن اصیل سے معلوم ہوا کہ شاہزادہ تمام رات اپنے محبوب کے

انتظار میں چاندنی پر سرگرداں رہا۔ اصیل نے ننھی سانولی سے کہا "افسوس ہے کہ تم کو مہربان شاہزادہ کی زحمت اور محبت کا کچھ بھی خیال نہ ہوا۔" ننھی سانولی رونے لگی۔ اس کی زبان سے نکلا:

"میں کیوں کر اتنی بڑی جرأت کروں۔ کیا یہ ملکہ کے ساتھ احسان فراموشی نہیں ہے کیا اُن کی عنایتوں اور کئی سال کی نوازشات کا بدلہ اس طرح دوں کہ ان کی چہیتی شہزادی کا حق غصب کر لوں۔ خود شہزادہ سلطان مرزا کو اس کا خیال رکھنا چاہئے۔ میں ملنے کو تیار ہوں ایک دفعہ نہیں سو دفعہ۔ مہربان شہزادہ کی خدمت ہمارے لئے راحت ہے لیکن ملنے ملنے میں بھی تو فرق ہے۔ اس طرح ملنا مجرمانہ خیانت ہے۔ تم شہزادہ سے صاف صاف کہدو کہ وہ خدا کے لئے میری محبت کا خیال دل سے نکال دیں"۔

خادمہ نے یہ پیام شہزادہ تک پہنچا دیا اور شام کو یہ جواب لائی کہ صاحب عالم ایک دفعہ تم سے مل لینے کے بعد تمھارا خیال ترک کر دیں گے وہ سمجھ رہے ہیں کہ تمھارا نہ ملنا اور گفتگو سے اجتناب کرنا ہی ان کو تمھاری طرف شدت کے ساتھ مائل کر رہا ہے۔

اب غریب ننھی سانولی مجبور ہو گئی۔ اِتمام حجت کے لئے وہ رات میں اس چاندنی پر پہنچی جو ان دونوں کے لئے جلوہ گاہِ طور سے کم نہ تھی۔ شہزادہ نے اس کو دیکھتے ہی دوڑ کر پھر اس کو اسی طرح اٹھا لیا اور اس زور سے گلے لگایا کہ ننھی سانولی کا نرم و نازک جسم کانپنے لگا۔ وہ بے تحاشہ رونے لگی اور شاہزادہ ابھی اس سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ سامنے کی فصیل پر دور سے کوئی شخص ان کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ اس کو دیکھ کر ننھی سانولی شہزادہ کے ہاتھوں سے ایک نیم بسمل شکار کی طرح نکل کر سیڑھیوں

کی طرف بھاگ گئی اور سیدھا اپنے کمرہ میں جا کر دم لیا۔

صبح ہی شاہزادہ نے کہلا بھیجا کہ "تم ناحق خوف زدہ ہو گئیں۔ کوئی شخص ہماری طرف نہیں آرہا تھا۔ چوکیدار فصیلوں پر رات میں گشت لگایا کرتے ہیں اور وہ ایک چوکیدار ہی کا سایہ تھا جو ہماری چاندنی پر بھی حرکت کرتا نظر آیا۔ چونکہ دور سے اس کے قدموں کی بھی آواز آرہی تھی اس لئے تم نے خیال کیا کہ شاید کوئی ہماری طرف آرہا ہے۔ حالانکہ فصیل سے محل کی چاندنی پر کوئی شخص نہیں آسکتا۔ ان دونوں کے درمیان کافی فصل ہے۔ تم ناحق ڈر گئیں۔ میں آج رات پھر تمھارا انتظار کروں گا۔" یہ کہہ کر خادمہ نے ننھی ساونلی کی بڑی ہمت بندھائی مگر اس نے کئی روز تک چاندنی کا رخ نہ کیا۔

ادھر شاہزادہ کا اضطراب روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ اس رات کی تشنہ ملاقات نے اس کے سازِ الفت کو پوری طرح چھیڑ دیا تھا۔ اس کو بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ اُس کا باپ سلطان محمد امین بڑا سخن فہم تھا اور چچا محمد قلی قطب شاہ تو خود نہایت اعلیٰ پایہ شاعر تھا۔ اس موروثی ذوق سے وہ کیونکر محروم رہ سکتا تھا۔ اب اس نے ننھی ساونلی کی یاد میں فارسی اور اردو میں نظمیں لکھنی شروع کیں۔ سب سے پہلی نظم میں اُس نے لکھا کہ:

"میں نے جب سے ننھی ساونلی کو دیکھا ہے میرے ہوش و حواس اسکی شانِ حُسن میں گم ہیں۔ اس کا سرو جیسا قد جب میری طرف بڑھتا ہی تو اس کا چہرہ چاند کی طرح روشن نظر آتا ہے۔ اس کی کمر اتنی نازک ہے کہ ہوا میں بل کھاتی ہے اور اسی لئے وہ اس پر چاند سورج جیسا چمکدار زرین دوپٹہ باندھے رہتی ہے۔ یہ اس کے حسن ہی کا پرتو ہے جس سے دونوں جہاں روشن ہیں۔ اس کی فرقت میں اگرچہ میں

تنہا نظر آتا ہوں لیکن کسی کو نہیں معلوم کہ میرے دل کی بستی اس کے
خیالات سے آباد ہے۔"

شہزادہ کی اِس حالتِ زار کی خبر اس کی محبوبہ تک برابر پہنچتی تھی۔ وہ شہزادہ سے کم بے تاب نہ تھی اور اپنے دل پر قابو رکھنے کی ناکام کوششوں میں دن رات سرگرم رہتی تھی۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں ملکہ کو اس واقعہ کی خبر نہ ہو جائے۔ اس نے اس معاملہ میں یکسوئی کر لینے کا تہیہ کیا اور اس کے بعد ہی جب شہزادہ کے یہاں سے پیام پہنچا اس نے رات میں چاندنی پر ملنے کا وعدہ کر لیا۔

اندھیری رات تھی شہزادہ اس کے فراق میں بےچین ٹہل رہا تھا کہ ننھی سانولی چاندنی پر نمودار ہوئی۔ شہزادہ اس کو پھر گلے لگا لینا چاہتا تھا لیکن وہ فوراً اس کے قدموں پر گر پڑی اور نہایت عاجزی سے عرض کیا:

"صاحب عالم میں ہرگز اس قابل نہیں ہوں کہ آپ جیسی ہستی میرے خیال میں اپنی اوقاتِ عزیز ضائع کرے۔ چونکہ ملکہ نے اپنی نوازش سے امرازادیوں میں میری بھی پرورش کی ہے آپ یہ سمجھتے ہوں گے کہ شاید میں بھی کوئی امیرزادی ہوں۔ آپ کو معلوم ہو جانا بہتر ہے کہ میں ایک قحط زدہ غریب لڑکی ہوں۔ میرے ساتھ محبت کرنا تو کجا میری طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی ایک نجیب الطرفین اور جلیل القدر شہزادہ کے شایانِ شان نہیں ہے۔"

شہزادہ نے اس کو اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور کہا "تم امیرزادی نہ سہی، میری محبوبہ تو ہو، تم کو میں نے بڑے بڑے امیروں کی لڑکیوں میں سے اپنے لئے منتخب کر لیا ہے، اب تم میرے لئے ہو اور میں تمھارا۔"

ننھی سانولی نے کہا "مگر صاحب عالم آپ سے تو شہزادی حیات بخشی بیگم منسوب ہیں! آپ میرے کیونکر ہو سکتے ہیں؟" شہزادہ نے جواب دیا "شادی کرنے والا میں ہوں نہ کہ شاہزادی۔ میں تمھاری خاطر اس رشتہ کو خیرباد کہدوں گا۔"

ننھی سانولی ۔ "یہ ناممکن ہے اس میں آپ کی اور سلطنت کی بدنامی ہوگی۔ اگرچہ میں بھی آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی لیکن ایسی زندگی سے کیا فائدہ جس سے اپنے محبوب کا سراسر نقصان ہو"۔

شہزادہ ۔ "تم دیوانی تو نہیں ہو گئی ہو؟ میرا کیا نقصان ہوگا؟ ممکن ہے شاہزادی سے شادی نہ کرنے کی وجہ سے چچا کا جانشین نہ بن سکوں، نہ سہی، کیا میرے والد بھی بادشاہ تھے جو مجھے بھی بادشاہت کی خواہش ہو! میں تمھاری خاطر اپنی ہر چیز قربان کرنے تیار ہوں"۔

ننھی سانولی ۔ "کاش میں اس قابل ہوتی کہ آپ میرے لئے یہ سب کرتے۔ میں اب محسوس کر رہی ہوں کہ اگر پیدا ہی نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ اگر ملکہ مجھے امیرزادیوں میں نہ پالتیں تو آج میں آپ کے راستہ میں حائل نہ ہونے پاتی"۔

شہزادہ ۔ "تمھاری اِن باتوں نے مجھے اور بھی تمھارا گرویدہ کر دیا۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بسا کیں دولت از گفتار خیزد

تم سمجھتی ہو کہ بنت عم سے عقد کرنا اور پھر اس کے صلہ میں چچا کے بعد بادشاہت حاصل کرنا میرے لئے نہایت ضروری اور باعث عزت ہے۔ یہ عنقریب ظاہر ہو جائے گا کہ میں تمھاری محبت کے مقابلہ میں ان چیزوں کو ٹھکراتا ہوں۔ میرے نزدیک ان کی ذرہ برابر اہمیت نہیں"۔

ننھی سانولی ۔ "آپ کو میری محبت نے اندھا بنا دیا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب یہ نشہ

اتر جائے گا تو آپ پچتائیں گے" یہ کہہ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی۔ شہزادہ نے اس کو روک لیا اور کہا "میں تم کو اس وقت تک جانے نہ دوں گا جب تک تم یہ وعدہ نہ کرلو کہ تم ہر حال میں میری شریک زندگی رہو گی"۔

ننھی سانولی پریشان تھی۔ کوئی جواب بن نہ پڑتا تھا۔ شاہزادہ نے اس کو پھر اپنے گلے سے لگا لیا اس کے نرم و نازک ہونٹوں کا بوسہ لیا اور چاہتا تھا کہ پھر گود میں اٹھالے لیکن وہ اس کے ہاتھوں میں سے مچھلی کی طرح تڑپ کر نکل گئی۔

چند روز تک شاہزادہ کی کوئی خبر نہ ملی۔ ننھی سانولی حیران تھی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ کبھی وہ یہ سمجھ کر خوش ہوتی کہ شاید شہزادہ نے دور اندیشی سے کام لے کر اس کا خیال ترک کر دیا ہو اور کبھی یہ خیال اس کو ستانے لگتا کہ نہ معلوم وہ کیوں خاموش ہو گیا۔ اس کی خاموشی میں سیکڑوں معنی پنہاں تھے۔ آخر کار ایک روز خادمہ ایک خط لے آئی جس میں شہزادہ نے لکھا تھا کہ:

"میں نے بیجاپور کو تمھارے ساتھ ہجرت کر جانے کا تہیّہ کر لیا ہے۔
اور آئندہ چہارشنبہ کو جب قلعہ میں بادشاہ کی سالگرہ منائی جائیگی
اور سب لوگ اس کے انتظامات میں مشغول ہوں گے تم اسی چاندنی
پر بے خوف چلی آنا میں تمھیں اپنے ساتھ بالاحصار سے اس طرح
نکال لے جاؤں گی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی"۔

ننھی سانولی اس خط کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ اس کے چہرہ پر ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کے حواس مختل ہو گئے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ نہ معلوم میری وجہ سے شہزادہ کو کن پریشانیوں میں مبتلا ہونا پڑے۔ شہزادہ کے اس جنون کو روکنے کا اس کے یہاں ایک ہی علاج تھا اور وہ یہ کہ اپنی ہستی کو شہزادہ کی

راہ میں قربان کردے۔ دوسرے روز دوپہر میں شہزادہ کو ننھی سانولی کا ایک خط ملا
جس میں لکھا تھا کہ:

"میں نے آج تک کوئی خط نہیں لکھا ہے اور نہ شاید آیندہ لکھوں گی۔
اور یہ بھی نہ لکھتی اگر معاملہ کی نزاکت کا خیال نہ ہوتا۔ اس خط کے بعد
اگر میں آپ سے نہ مل سکی تو بصد لجاجت التجا ہے کہ آپ اپنی
بادشاہت کے زمانہ میں اس محبت کی یادگار میں ایک محل تعمیر
کرائیں جس کا نام گوشہ محل ہو۔ اور محلات کی شریف لڑکیاں اور
شہزادیاں اس محل میں پرورش پاتی رہیں اور گوشے پردے ہی میں
زندگی کی ہر نعمت سے لطف اندوز ہوسکیں اور ان کی بے پردگی کی
وجہ سے شہزادوں کو عشق و محبت کی جال میں پھنس کر سلطنت سے
ہاتھ دھو بیٹھنا نہ پڑے......."

شہزادہ یہ خط پڑھ ہی رہا تھا کہ محل سے شور و غل کی آواز سنائی دی۔ وہ
فوراً اس چاندنی کی دیوار کے نزدیک پہنچ گیا جس پر محل کی لڑکیاں جمع ہو کر کھیلا کرتی
تھیں۔ معلوم ہوا کہ وہاں آج بھی ننھی سانولی کی فرمایش پر پانی کھیلا جا رہا تھا اور اسی
وقت وہ اپنی ہمجولیوں سے پانی کھیلتے کھیلتے شش منزلہ محل پر سے نیچے کود پڑی ہے۔
شاہزادہ دوڑتا ہوا قریب پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی پیاری محبوبہ کی لاش خاک و
خون آلودہ پڑی ہوی ہے اور محل کی تمام عورتیں اس کے اطراف نوحہ کناں جمع
ہو رہی ہیں۔

یہ ایسا واقعہ نہ تھا کہ شہزادہ سلطان مرزا حیات بخشی بیگم کے ساتھ اپنی
شادی اور پھر تخت نشینی کے بعد اس کو بھول جاتا۔ اکثر دفعہ تنہائی میں وہ اپنی محبوبہ کی

شرافت اور جاں نثاری کے واقعہ کو یاد کر کے بیچین ہو جاتا تھا۔ اس کی وصیت کا بھی ہر وقت اس کو خیال رہا۔ اور جب اس نے مکہ مسجد کا سنگِ بنیاد اپنے ہاتھوں سے رکھا تو اس کے بعد ہی گوشہ محل کی مشہور عمارت کی بھی بنا ڈالی جس میں بالا حصار سے زمین دوز راستہ کے ذریعہ سے اہل محلات کی آمد و رفت ہوتی تھی۔ اس کا حوض اتنا بڑا بنایا گیا تھا کہ پردہ نشینانِ حرم گوشے پردے میں رہ کر پیرا کی اور کشتی رانی کی مشق کیا کرتیں۔

اب نہ تو وہ حوض ہی اصل حالت میں باقی ہے نہ وہ ساز و سامان تفریح۔ لیکن گوشہ محل کا نام بچے بچے کی زبان پر ہے اور یقیناً یہ نام ہمیشہ زندہ رہے گا جو ننھی سانولی کی شریفانہ وصیت کا عملی نتیجہ اور اس کے درپردہ عاشق کا زندہ کارنامہ ہے!!

بیس ۲۰ پیسے

سلطان محمد قطب شاہ الٰہی محل میں مشغول مطالعہ تھے۔ آج معمول سے زیادہ وقت اس قصر میں گذر چکا تھا۔ حیدر آباد کے داد محل کے رفیع الشان ایوان ارکان دولت، امرائے دربار اور علماء و فضلاء کے علاوہ حاجت مندوں اور داد خواہوں سے معمور تھے۔ یہ بارگاہ ہر کس و ناکس کی امیدوں اور آرزوؤں کا ماویٰ و ملجا تھی۔ امراء اپنے محبوب بادشاہ کی قدمبوسی، اور غربا اپنی حاجت براری کے لئے بے چین تھے۔ ان سب پر انتظار کا ایک ایک لمحہ گراں گذر رہا تھا۔ مگر یہ کٹھن گھڑیاں جواں سال بادشاہ کے ذوق علم و فضل اور نیک نفسی کے تذکروں میں کٹ رہی تھیں۔

خدام شاہی اور مقربانِ خاص شاہی باورچی کو گھیرے ہوئے تھے جو ایران کے سفر سے ابھی ابھی واپس آیا تھا۔ اور اپنے وطن کے حالات اور دورانِ سفر کے دلچسپ واقعات خوش آیند پیرائے میں بیان کر رہا تھا۔ وہ ڈیڑھ سال قبل اپنی شادی کے ارادے سے بادشاہ سے اجازت لے کر گولکنڈہ سے ایران کو روانہ ہوا تھا اور یہ توقع کسی کو نہ تھی کہ اس قدر جلد بصحت و سلامتی واپس بھی آسکے گا۔ وہ کئی سال گولکنڈہ میں رہ چکا تھا اور سلطان کے باورچی خانے کا خاص رکاب دار ہونے کی وجہ سے دیگر خدام شاہی اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اس وقت

ہر شخص اس کے حالاتِ سفر سننے کا مشتاق تھا لیکن خود وہ بادشاہ کی قدمبوسی کے لئے مضطر تھا اور اپنے دوست احباب سے کہہ رہا تھا کہ میں نے زمانۂ سفر میں کئی ملک اور کئی بادشاہ اور امیر دیکھے لیکن سلطان محمد قطب شاہ جیسا متقی، پرہیزگار اور صاحب دل انسان کہیں نظر نہ آیا۔ کیا ایران کیا عراق، ہر جگہ گولکنڈہ کے ہیروں سے زیادہ یہاں کے بادشاہوں کے اعلیٰ کردار کی شہرت ہے۔ اِس حالیہ سفر نے تو میری آنکھیں کھولدیں اور خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے آقا پر اپنی جان نثار کرنے کے لئے بخیر و عافیت واپس آگیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے اہل اللہ بادشاہ کی خدمت وہ سعادت ہے جو کس و ناکس کو نصیب نہیں ہو سکتی۔

سلطان محمد قطب شاہ نے ایوان دربار میں قدم رکھتے ہی اپنے خاص باورچی کو یاد کیا۔ حاضرین دربار حیران تھے کہ یہ شخص تو ابھی ابھی قافلہ سے نکل کر دربار میں پہنچا ہے، بادشاہ کو اس کی واپسی کی کیونکر اطلاع ہو گئی۔ بادشاہ کو دیکھتے ہی باورچی نے قدمبوس ہو کر عرض کیا کہ :۔

"بندگانِ عالی کی قدم بوسی کی عزت ایک عرصہ کے بعد نصیب ہوئی ہے جتنے دن حضور کے قدموں سے دور رہا ایک ایک گھڑی ایک ایک سال معلوم ہوتی تھی۔ آج پھر میری قسمت نے یاوری کی اور خدا نے اس قابل کیا کہ ظل اللہ کے قدموں کی خاک سے اپنی آنکھوں کو منوّر کروں"۔

بادشاہ نے اپنے قدیم خادم کی خیر و عافیت دریافت کر کے اطمینان کا اظہار کیا۔ لیکن باورچی اپنے آقا کے قدموں پر سے اپنا سر ہٹانا نہ چاہتا تھا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے بادشاہ نے تلطف آمیز لہجہ میں ارشاد فرمایا :-

"تم اپنا سر اٹھاؤ ہم جانتے ہیں تمھارے دل میں جو خدشہ ہے!

باورچی نے دست بستہ عرض کیا :-

" حضور میں بڑا قصور وار ہوں! بارگاہِ عالی سے رخصت ہوتے وقت میں بے حد مایوس تھا کیونکہ جب میں نے اپنی شادی کے لئے وطن جانے کی اجازت چاہی تو حضور نے حکم دیا کہ تم جا سکتے ہو لیکن پہلے ہمارے امراء اور خدام دولت سے بھی رخصت ہو لو اور شہر پناہ سے نکلتے وقت ہماری بارگاہ میں آنا۔ فدوی کو ہر امیر نے اپنے حسب حیثیت سرفراز کیا اور بعضوں نے تو ہزار ہزار ہون کا توڑا بھی ساتھ کر دیا تھا لیکن آخر میں جب ظل سبحانی کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور نے صرف بیس۲۰ پیسے عنایت کئے تھے جن کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا اور رعب سلطانی کی وجہ سے کچھ عرض نہ کر سکا۔ جب میں اس بارگاہ سے نکل رہا تھا میرا دل مایوسی اور نامرادی کی وجہ سے بیٹھا جا رہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میرے مقسوم میں یہی لکھا تھا کہ چشمۂ آب حیات تک پہنچ کر بھی پیاسا رہوں۔ اِس مایوسانہ حالت میں میرے دل میں طرح طرح کے خیالات کا ہجوم تھا اور ممکن ہے کہ اپنے آقا کی نسبت

میرے گمان نے کوئی بے ادبی بھی کی ہو جس کی وجہ سے میں اپنے تمام زمانۂ سفر میں نادم رہا اور اس وقت اس کی معافی کا بصد ادب خواستگار ہوں۔"

بادشاہ نے فرمایا:۔

"تم ہر طرح مطمئن رہو۔ اپنے سفر کے واقعات بیان کرو۔ تمھارے قدیم دوست احباب بھی تمھارے حالات سننے کے مشتاق ہوں گے!"

باورچی نے عرض کیا:۔

"بارگاہِ خداوندی سے ناکام جانے کا مجھے بڑا قلق تھا۔ جب میں جہاز پر اپنے وطن کی طرف چلا جارہا تھا تو رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا۔ اور حضور کے عنایت کئے ہوئے تانبے کے سکے مجھے بار گراں معلوم ہو رہے تھے۔ چنانچہ کئی دفعہ میں نے ارادہ کیا کہ ان کو سمندر میں پھینک دوں لیکن پھر کسی نہ کسی وجہ سے رک گیا۔ چند روز کے بعد ہمارا جہاز ایک بندرگاہ پر ٹھہرا۔ وہاں ایک شخص انار بیچ رہا تھا۔ اکثر مسافروں نے دو دو چار چار انار خریدے۔ میں نے بھی خیال کیا کہ یہ پیسے ایران ساتھ لیجا کر کیا کروں گا بہتر یہ ہے کہ یہیں ہندوستان کے ساحل پر خرچ کر دوں۔ چنانچہ میں نے وہ پانچ گنڈے انار والے کو دیدئے۔ اُن کے بدلہ میں اُس نے بیس انار میرے حوالے کئے۔ جن کو میں نے اپنے سفری تھیلے میں

ڈال دیا اور پھر خیال تک نہ آیا کہ اُن کا کیا حال ہوا۔ میں خوش تھا کہ اب تانبے کے اُن بیس[۲] سکوں سے میری جیب ہلکی ہو گئی ہے۔

چند ہی روز گذرے تھے کہ ہمارے جہاز میں ملک التجار کا اکلوتا لڑکا سخت بیمار ہو گیا۔ طبیبوں نے بہت علاج کیا مگر حالت سقیم ہی ہوتی گئی۔ اطبا نے مشورہ دیا کہ اب صرف انار سے اس لڑکے کی جان بچ سکتی ہے۔ ملک التجار نے مسافروں سے دریافت کیا۔ کسی کے یہاں انار نہ ملا۔ مریض کی حالت روز بروز ابتر ہونے لگی آخر ملک التجار نے بڑے عجز کے ساتھ ہر مسافر سے کہا کہ ایک ایک انار کے لئے ایک ایک اشرفی نذر کروں گا۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے اور دیکھئے۔ ممکن ہے ڈھونڈھنے سے آپ کے سامان میں کہیں انار نکل آئے۔

مجھے یاد ہی نہ تھا کہ میں نے بھی انار خریدے تھے؟ اب جو ملک التجار کی عاجزی اور پریشان حالی دیکھی تو یکایک مجھے اپنی وہ حالت یاد آگئی جو ظلِ سبحانی کی بارگاہ سے سونے کی جگہ تانبے کے سکے حاصل کرنے کی وجہ سے مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔ اُن پانچ گنڈوں کے پیسوں کی یاد کے ساتھ ہی مجھے اناروں کا خیال آگیا۔ میں دوڑتا ہوا اپنے سامان کی طرف گیا اور تھیلا کھول کر دیکھا تو د[۲]و انار سڑے ہوئے

نکلے اور باقی کے اٹھارہ انار اچھی حالت میں تھے۔ جن کے معاوضے میں اٹھارہ ہزار اشرفیاں مل گئیں اور میری قسمت پر جہاز کا ہر شخص رشک کرنے لگا۔"

اٹھارہ ہزار اشرفیوں کا ذکر سنتے ہی بادشاہ نے تعجب کا اظہار کیا کہ :۔

"تمھیں تو بیس۲۰ ہزار اشرفیاں ملنی چاہیے تھیں۔ یہ سمجھ میں نہ آیا کہ دو۲ ہزار کم کیوں ہوگئیں ؟"

بادشاہ کی اس پُراسرار گفتگو پر دربار میں سناٹا چھا گیا۔

ظلِ سبحانی نے اپنے خادم خاص کے ذریعہ سے ملکۂ زمانی حیات بخشی بیگم کے یہاں کچھ کہلا بھیجا۔ جب خادم نے دولت خانۂ عالی سے واپس آکر بادشاہ سے جواب عرض کیا

تو سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے باورچی سے فرمایا :۔

"ہم نہیں چاہتے تھے کہ یہ بات ظاہر کی جائے لیکن اب کہنا پڑتا ہے کہ ہم اپنے لئے خانگی اوقات میں قرآن شریف کی کتابت کر کے کچھ پیسے حاصل کر لیتے ہیں چنانچہ تم کو جو پیسے دئے گئے وہ ہماری ذاتی کمائی یعنے اکل حلال کے تھے لیکن ابھی معلوم ہوا کہ ملکہ نے جو روزانہ رات میں پنکھے سی کر اپنے خانگی خرچ کے لئے رقم حاصل کرتی ہیں اُن میں سے دو۲ پیسے چراغ کے لئے ارنڈی کا تیل منگانے میں صرف کر دئے تھے اور جب

یں نے وہ بیس ۲۰ پیسے منگوا بھیجے تو انھوں نے سرکاری رقم
یں سے دو پیسے ان یں ڈالکر پانچ گنڈوں کو پورا کیا تھا
چنانچہ یہی دو ۲ پیسے تھے جن کی وجہ سے افسوس ہے کہ تمھاری
دو ہزار اشرفیاں ماری گئیں۔"

پانچ اشرفیاں

"اگر اس سرزمین میں ایسے غریب اور محتاج باقی ہیں جن کو محنت و مشقت کے باوجود دن بھر میں ایک وقت سے زاید کھانا میسّر نہیں ہوتا تو میں سمجھتی ہوں کہ گذشتہ پچاس سال میں میرے والد میرے شوہر اور میں نے خود بھی اس ملک کی سرسبزی و شادابی اور ہر طبقہ کی فلاح کے لئے جو کوششیں کی ہیں وہ سب رائگاں گئیں۔ رعایا کی خوشحالی سلطنت کے بقاء و استحکام کی ضامن ہوتی ہے۔ میں اپنے نورِعین کے ہاتھ میں اُس وقت تک حکومت کی باگ نہیں دے سکتی جب تک مجھے یہ یقین نہ ہو جائے کہ سلطنت میں امن و امان ہے، رعایا خوش حال ہے، اور اہل دربار کے اخلاق و عادات اِس درجہ قابل اعتماد ہیں کہ کسی بیرونی حملے اور سازش کا احتمال تک نہ ہو۔"

حیدر آباد کے مشہور رانند محل میں ملکۂ جہاں خدیجۂ زماں حیات بخشی بیگم ماں صاحب نے گولکنڈہ کے وزرائے خاص سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ وزیروں نے ملکہ کی ترقی عمر و اقبال کے لئے دعائیں دیں اور دست بستہ عرض کیا:۔

"حضور ہم سب خانہ زادوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی بادشاہ بیگم اور اپنے جوان بخت وجواں عمر سلطان عبداللہ قطب شاہ کے قدموں پر اپنی جان تک نثار کرنے کے لئے ہر وقت حاضر ہے۔ پھر بھی اگر ہم میں سے کسی کی نسبت ملکۂ زماں کو شبہ ہو تو ہم سب تیار ہیں کہ اس کو آپ کے ادنےٰ اشارہ پر دربار سے نکال باہر کردیں۔ وفاداری ہمارا شیوہ ہے اور اپنے آقا کے لئے اپنی جان پر کھیلنا ہمارا پیشہ!"

ملکہ نے مسکراتے ہوئے کہا:۔

"مجھے تو امراء سے زیادہ غریبوں کا خیال ہے۔ تمھارے مرحوم بادشاہ کا مقولہ مجھے ہر وقت یاد آتا رہتا ہے کہ امیر امراء ہمیشہ طاقتوروں کا ساتھ دیتے ہیں اور ان کے برخلاف غرباء ہر وقت اپنے ضمیر کے تابع اور ایمان وایقان کے پکے ہوتے ہیں اور ان کا جذبۂ وفاداری ہمیشہ قابل اعتماد رہتا ہے۔ اسی لئے میرا اور میرے آبا و اجداد کا یہی طریقہ رہا ہے کہ عوام اور غرباء کی طرف زیادہ توجہ کی جائے اور خلق اللہ کی آسایش اور رفاہ عام کے کام ہمیشہ جاری رکھے جائیں۔"

ملکہ کے ان اعلیٰ خیالات کا وزیروں پر خاص اثر ہوا۔ وہ بالکل خاموش تھے اُن میں سے ایک محمد سعید اردستانی نے عرض کیا کہ:۔

"ہم تمام جاں نثار اس وقت خلق اللہ ہی کی نمائندگی کرنے کے لئے ملکۂ جہاں کی خدمت میں حاضر ہیں۔ تمام ملک کی

دلی خواہش یہی ہے کہ دودمانِ قطب شاہیہ کے چشم و چراغ سلطان عبداللہ ظل اللہ زمام حکومت سنبھالیں"۔

ملکہ نے فرمایا :-

"میری بھی سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ اپنے فرزند جگر بند کو اس رفیع الشّان سلطنت پر کامیابی کے ساتھ حکومت کرتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ خدا وہ دن جلد لائے کہ میری یہ تمنّا بر آئے۔ بارگاہ ربّ العزّت میں شب و روز یہی دعا کرتی ہوں۔ میں تمھاری درخواست معلوم کر کے خوش ہوئی اور انشاءاللہ بہت جلد میں رعایا کی حالت اور ملک کے امن و امان کے متعلق بھی تجربہ کروں گی۔ اگر یہ کامیاب ثابت ہوا تو تمھاری اور میری، ہم سب کی دلی آرزو بہت جلد پوری ہو سکے گی"۔

محمّد سعید نے دست بستہ عرض کیا :-

"اگر حضور اجازت عطا فرمائیں تو عرض کرنے کی جرات کی جا سکتی ہے کہ رعایا تو ملک و مالک پر فدا ہے اور ہماری مطیع و منقاد؟ ان کی خوش حالی اور فارغ البالی کا چرچا دور دور تک ہے۔ دوسرے ملکوں میں ہر شخص یہی کہتا ہے کہ گولکنڈہ میں تو ہُن برستے ہیں اور وہاں کا ہر پتھر ہیرا بنکر چمکتا ہے۔ بندگانِ عالی جو تجربہ کرنا چاہتے ہیں وہ بہت مشکل کام ہے۔ حضور ہم پر اعتماد فرمائیں اور یہ فدوی ہر طرح یہ امر ثابت کرنے کے لئے تیار ہے کہ امراء اور رعایا کی طرف سے کبھی کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو گی

جو ملک کے مفاد اور مالک کی مرضی کے خلاف ہو۔"

ملکہ نے جواب دیا:۔

"تمھارے جذبۂ وفاداری اور شیوۂ جان نثاری کے اظہار سے اطمینان ہوا مگر میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ عوام کی حالت کا اندازہ کرنا میرے لئے ضروری ہے۔ تم پر وہ ذمہ داری عاید نہیں ہے جو ایک بادشاہ پر ہوتی ہے .... بادشاہ کے نزدیک امیر اور غریب سب برابر ہیں۔ اس کی نظر آفتاب کی شعاع ہے جو پست و بلند ہر جگہ یکساں پڑتی ہے۔ امیر کہاں غریبوں کا خیال رکھ سکتے ہیں جب کہ وہ خود آپس میں ایک دوسرے کی ترقی اور خوش حالی کو دیکھ نہیں سکتے۔ ممکن ہے کہ کسی سلطنت کے وزیروں یا امیروں کو وہاں کے غریبوں کی ذہنی و معاشی حالت کے متعلق تجربہ کرنا مشکل معلوم ہو مگر بادشاہ کے لئے یہ بہت آسان ہے۔ خدا چاہے تو میں تم سب کو دس روز کے اندر اندر ہی اپنے تجربہ کے نتیجہ سے مطلع کر دونگی۔ اور اسی نتیجہ پر میری اور تمھاری خواہش کی تکمیل کا انحصار ہے۔"

اُسی روز شام میں دولت خانۂ عالی سے خواجہ سراؤں اور ماماؤں نے چاندی کے ایک تھالے میں پانچ اشرفیاں اور چاندی کی مختلف اشیاء لاکر چار منار کے قریب سرِ راہ رکھدیں اور شہر میں مشہور ہو گیا کہ محل شاہی سے سلطان

عبداللہ قطب شاہ کا صدقہ برآمد ہوا ہے۔

آٹھ دن اور آٹھ راتیں گذر گئیں۔ نویں روز علی الصبح ملکہ نے محل کی ایک اصیل کو روانہ کیا کہ دیکھ آئے کہ اُس سامانِ صدقہ کا کیا حشر ہوا۔ اصیل نے واپس آکر عرض کیا کہ پانچوں اشرفیاں اور جملہ سامان بالکل اسی طرح اسی جگہ رکھا ہوا ہے جس جگہ پہلی دفعہ رکھا گیا تھا۔

ملکہ نے وزرائے سلطنت کو طلب کیا اور فرمایا کہ:-

"میں نے جس تجربہ کا ذکر کیا تھا آج اس کا نتیجہ برآمد ہو گیا؟ رعایائے سلطنت کی حالت ہر طرح قابل اطمینان ہے اور اب تم سب مطمئن ہو جاؤ کہ سلطان کو زمام حکومت سپرد کر دی جائیگی"۔

سب وزیر حیرت زدہ تھے۔ ان میں سے ایک نے جرأت کر کے عرض کیا:-

"ملکۂ زمانی کی فہم و فراست ہمارے وہم و خیال کی رسائی سے بالا ہے۔ ہم کو حیرت ہے کہ حضور نے ایسا کیا طریقہ اختیار کیا ہوگا جو اتنی قلیل مدّت میں حیدر آباد جیسے وسیع ملک کی رعایا کی ذہنی و معاشی حالت سرکار کے سامنے بے نقاب ہو گئی!!"

ملکہ نے پوچھا:-

"کیا ان دنوں تم میں سے کسی کا گذر چار منار کی طرف ہوا ہے؟"

وزرا نے متفق اللفظ ہو کر کہا:-

"کسی وقت کیا معنی۔ حضور ہم تو دن میں کئی بار اُدھر ہی سے

گذرتے ہیں!"

"پھر تمھیں وہاں کوئی غیر معمولی چیز نظر نہیں آئی؟"

وزرا آپس میں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ محمد سعید نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ:۔

"میں نے دیکھا تو نہیں سنا ہے کہ حضرت ظل سبحانی سلطان عبداللہ قطب شاہ کا صدقہ ملکۂ زمانی نے چار منار کے قریب رکھوایا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

سب خاموش تھے۔ ملکہ نے فرمایا کہ:۔

"تم سلطنت کے ذمہ دار افراد ہو اور تمھیں کچھ خبر نہیں؟ بہتر یہ ہے کہ اسی وقت سب جاکر دیکھ آئیں۔"

قطب شاہی وزرا نے چار منار کے قریب جاکر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ملکہ نے چند روز قبل بادشاہ کا صدقہ بھیجا اور اس وقت سے کوتوالی کے پہرہ کو یہاں سے برخواست کر دیا ہے وزیروں نے صدقہ کی چیزوں کا معاینہ کیا اور دولت خانۂ عالی میں واپس ہو کر ملکہ سے جو کچھ دیکھا تھا بیان کیا۔

ملکہ نے فرمایا کہ:۔

"آج نواں روز ہے کہ میں نے صَدقہ نکلوایا تھا۔ اَب مجھے معلوم ہوا کہ میں خدا کے فضل سے اس قابل ہوں کہ اپنی موروثی سلطنت کو اپنے فرزند دلبند کے سپرد کر دوں۔ میں نے اب تک اس امانت کی نہایت دیانت کے ساتھ حفاظت کی

اور اب ایک ایسی حالت میں اس امانت کو نوجوان بادشاہ
کے سپرد کر رہی ہوں کہ آئندہ کوئی مجھ پر کسی طرح کا الزام نہیں
لگا سکتا۔ میں اب اطمینانِ خاطر کے ساتھ اس ذمہ داری سے
سبکدوش ہو کر حیات نگر میں گوشہ نشین ہو جاتی ہوں اور اپنے
فرزند، اپنی سلطنت، اور تم سب کو خدا اور اُس کے رسُول کی
حفاظت میں چھوڑتی ہوں۔"

بعد میں ملکہ نے جملہ ارکینِ سلطنت اور امرائے دربار سے حلفی وعدے لیے کہ اِس جواں سال بادشاہ کی اطاعت سے کبھی منحرف نہ ہوں گے اور بر وقت اپنی جان تک نثار کرنے کے لئے تیار رہیں گے۔

سلطان عبداللہ کے با اقتدار ہونے کے کچھ عرصہ بعد ہی محمد سعید نے بادشاہ کے دل میں کچھ ایسی جگہ پیدا کر لی کہ بالآخر میر جملہ کے خطاب اور صدر اعظمی کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا اور سلطنت کے جملہ امور اُسی کے قبضۂ اقتدار میں آگئے۔ وہ چند سال بعد ہیروں کے لالچ میں گولکنڈہ سے نکلا اور توسیع سلطنت کے بہانہ سے تمام شاہی افواج کو اپنے ساتھ لیتا گیا۔

اس اثناء میں بادشاہ میر جملہ کی بعض مفسدانہ حرکات سے ناراض ہو گیا تو اس بدکیش نے شہزادہ اورنگ زیب کو گولکنڈہ پر دھوکہ سے حملہ کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ جس وقت مغل فوجیں قطب شاہی سلطنت کے حدود پر منڈلا رہی تھیں ضعیف العمر ملکہ حیات بخشی بیگم کو گوشہ نشینی چھوڑ کر پھر حیدر آباد آنا پڑا۔ انھوں نے میر جملہ کے یہاں اپنے ملازمینِ خاص روانہ کئے اور کہلا بھیجا کہ

شاہی فوجیں لے کر فوراً حیدر آباد چلے آئے اور اپنے اس حلفی عہد و پیمان کو پورا کرے جو سلطان کے زمامِ حکومت ہاتھ میں لیتے وقت اُس نے ملکہ سے کیا تھا۔

احسان فراموش میر جملہ نے جواب دیا کہ :۔

"شاید ملکہ کو مرحوم سلطان محمد قطب شاہ کا وہ مقولہ یاد نہیں رہا کہ امراء ہمیشہ طاقتوروں کا ساتھ دیتے ہیں اور اُن کا ضمیر سیاست کا غلام ہوتا ہے۔"

دغا باز میر جملہ کا یہ جواب ملکہ کو اس وقت ملا جب اورنگ زیب حسین ساگر کے کٹہ تک پہنچ چکا تھا اور سلطان عبداللہ دھوکہ میں آکر اُس کے استقبال کے لئے نکلا تھا۔ جب راستہ میں بادشاہ کو معلوم ہوا کہ مغل سوار اس کو قید کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں تو وہ فوراً محل کی طرف پلٹا۔ لیکن اس اثناء میں مغل اس کے قریب پہنچ چکے تھے اور وہ ان کے زغہ میں پھنس جاتا اگر حیدر آباد کے غرباء ان مغلوں کا راستہ نہ روک دیتے۔

عبداللہ قطب شاہ کی اس نازک حالت کی اطلاع قرب وجوار کی گلیوں میں برقی رو کی طرح دوڑ گئی اور کثرت سے اہلِ شہر بادشاہ کو بچانے کے لئے اپنے اپنے گھروں اور دوکانوں سے نکل پڑے۔ اِس خدائی فوج نے مغلوں کا جان توڑ مقابلہ کیا۔ کئی غریب اہلِ شہر اپنے ملک و مالک کی راہ میں شہید ہوگئے اور سیکڑوں زخمی ہوئے۔ اس اثناء میں بادشاہ صحیح و سالم دولت خانۂ عالی میں پہنچ کر سرنگ کے ذریعہ سے قلعہ گولکنڈہ میں داخل ہوگیا۔

جب ملکہ کو معلوم ہوا کہ شہر کے غریبوں نے کس طرح اپنے بادشاہ کو بچا لیا
تو اس کی زبان سے اس کے مرحوم شوہر کا وہ جملہ بے ساختہ نکل پڑا :-

"غریب ہر وقت اپنے ضمیر کے تابع اور ایمان و ایقان کے پکّے
ہوتے ہیں اور ان کا جذبۂ وفاداری ہمیشہ قابلِ اعتماد ہوتا ہے"۔

اُس نے شہیدانِ وطن کے ورثاء اور تمام زخمیوں کو فی کس پانچ پانچ
اشرفی انعام عطا کیا۔

ملکِ خوشنود

۱۰۴۵ھ

اب تک تین دفعہ ہم یہاں گئے ہیں اور ہر وقت آثار قدیمہ کی سیر میں کئی کئی گھنٹے گذر چکے ہیں اور ابھی نہیں معلوم کتنی دفعہ ان کھنڈروں کی خاک چھاننی پڑیگی؟ اس قلعہ کے باشندے، ہمارے احباب، بیان کرتے ہیں کہ احاطۂ قلعہ کے علاوہ فصیلوں کے باہر اطراف و اکناف میں بھی سیکڑوں آثار قابلِ دید ہیں۔ آج ہم اپنے دوست "مرشد" کے ساتھ ایک نوجوان فوجی عہدہ دار کے مکان میں داخل ہوئے۔ مشہور ہے کہ وہ اس اجڑی ہوئی بستی کے چپہ چپہ سے واقف ہیں۔ لیکن انھوں نے ناسازیٔ مزاج کے باعث آج ہماری رہنمائی سے معذرت چاہی۔ ہم میں سے ایک نے ان کی تعریف کرتے ہوئے اُن سے پوچھا کہ:۔ "صاحب! قلعہ اور اہل قلعہ سے متعلق اتنی معلومات آپ کو کن کن ذریعوں سے حاصِل ہوئیں" انھوں نے جواب دیا کہ:۔ "جناب! یہ نہ پوچھئے۔ یہ ذوق مجھے ورثہ میں ملاہے۔ میرے والد اسی میں محو رہتے تھے۔ وہ ڈاکٹر تھے لیکن دواخانہ کے اوقات کے بعد ان کا تمام وقت ہمسایہ در و دیوارِ شکستہ کی زیارتوں میں گزر جاتا۔ میرے دادا کو میرے والد سے زیادہ ان چیزوں کا شوق تھا۔ انھوں نے تو یہاں کے نقش و نگار کے متعلق ایک کتاب بھی لکھی تھی۔"

کتاب! سنتے ہی میرے کان کھڑے ہوگئے۔ مجھے کتابوں کا شوق اور وہ بھی اِن اُمور کے متعلق بے پایاں ہے۔ میں بے چین ہوگیا اور گفتگو ختم ہونے سے پہلے پوچھا:۔ "کیا وہ کتاب آپ کے یہاں اب بھی موجود ہے؟"

"جی ہاں! ہوگی، مگر معلوم نہیں اس وقت کہاں رکھی ہوئی ہے" اس نوجوان نے ایسے انداز میں کہا جس سے شبہ ہو رہا تھا کہ یا تو کتاب کا قصہ سرے سے غلط ہے یا انھیں ہم سے اندیشہ ہے کہ کہیں حریفانِ بادہ کی طرح ہم اس ساغر کو بھی نہ ہضم کر جائیں۔ میں نے یقین دلاتے ہوئے کہا:۔

"آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم آپ کے دادا صاحب کی کتاب اپنے ساتھ لیجانا چاہتے ہیں۔ ہم صرف چند صفحات الٹ پلٹا کر دیکھیں گے۔ پھر آپ کی کتاب یہیں آپ کو واپس کر دی جائے گی"۔

میرے ساتھیوں نے بھی میری ہاں میں ہاں ملائی اور فوجی عہدہ دار کو یقین آگیا۔ وہ یہ کہتے ہوئے زنانہ حصّہ کی طرف گئے۔

"دیکھئے اگر مل جائے تو ابھی لاتا ہوں"۔

ہم اپنی کامیابی پر نازاں تھے آخر تھوڑی ہی دیر میں ہمارے میزبان ایک لانبی چوڑی کتاب مجلد لے ہی آئے اور کہا:۔

"لیجئے! اس کا سمجھنا بہت مشکل ہے قدیم زبان میں لکھی ہے"

میں نے فوراً ہاتھ بڑھا کر وہ کتاب ان سے لے لی اور کہا "کچھ نہ کچھ مطلب تو سمجھ میں آہی جائے گا۔ کتاب کے اوراق الٹنا شروع کئے۔ جگہ جگہ فصلوں کی ذیلی سرخیاں تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف واقعات پر چھوٹے چھوٹے مضامین لکھے ہیں۔ اسی ورق گردانی میں میری مذاق کی چیزیں بھی ملتی گئیں۔ گولکنڈہ کے شعر و سخن کا تذکرہ تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر سے چند سطریں پڑھیں۔ بہت سی کار آمد باتیں بھی تھیں میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا:۔

"حامد تم یہاں سے پڑھتے جاؤ میں نوٹ کرتا جاؤں گا۔ کیوں جناب!

اگر میں اس کتاب سے کچھ نوٹ کر لوں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا۔"
میں نے مالک سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ انھوں نے بخوشی اجازت دی قدیم زبان تھی حامد رک رک کر پڑھ رہے تھے اور میں خوش تھا کہ مجھے ایک کار آمد کتاب سے بہت کچھ نقل کر لینے کا موقع ہے۔ جب کام ختم ہو گیا ہم نے شکریہ کے ساتھ کتاب واپس کر دی اور چونکہ دیر ہو چکی تھی کسی اور وقت آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے رخصت ہوئے۔
اس کتاب کے اکثر واقعات تاریخی اور دلچسپ ہیں۔ یہ قصّہ دوستوں کے اصرار پر اسی کتاب سے مگر اپنی زبان میں نقل کر رہا ہوں :-

"کیا یہ وہی ملک خوشنود ہے، جو خدیجہ سلطان کے جہیز میں ایک سو ایک زرین کمر غلاموں میں شامل تھا؟"

"جی ہاں وہی حبشی جس کو سلطان محمد قلی نے ملک الشعراء، وجہی کی تیمار داری کے لئے روانہ کیا تھا؟"

شاہی مصوّر نے خطاط خاں کو جواب دیا۔

"اہا! اب سمجھا میں اس زمانے میں نیا نیا شاہی ملازم ہوا تھا اور وہ میرے یہاں پانچویں منزل میں جہاں پناہ کا کلام بیاض میں نقل کرنے کے لئے لایا کرتا تھا!"

"یہی کیا! پچاسوں دفعہ چوتھی منزل میں بھی یہ آیا ہے۔ ایک دفعہ اس کی شوخی پر اس کو ڈانٹ بھی بتائی تھی۔ بلا کا تیز طبع تھا ایک روز میں حضور کی غزل کی وصلی پر حاشیہ بنانے کے لئے رنگ ملا رہا تھا۔ اس سے تیل کا شیشہ مانگا۔ شیشہ تو لایا مگر وصلی پر اونڈیل دیا ساری محنت بیکار گئی۔ دوسری وصلی تیار کرنی پڑی۔"

"کچھ ہی ہو قسمت اس کو کہتے ہیں! ہم تو کولہو کے بیل کی طرح جہاں تھے وہیں رہے اور یہ کل کا بچہ آج بیجاپور کا سفیر ہو کر اپنے وطن کو واپس آیا ہے۔"

یہ دونوں بوڑھے آہستہ آہستہ کٹورا حوض کی طرف چلے جا رہے تھے۔ یہ تالاب نما حوض گولکنڈہ کے وسط میں عجیب سیر کا مقام ہے۔ اس کے چاروں کنارے شہر کے خوش باشوں اور اہلِ علم طبقے کی مقبول ترین تفریح گاہیں شمار کئے جاتے ہیں۔ حوض کے اطراف دُور دُور تک سبزہ زار ہے جس پر ہر روز سرِ شام شاعر، انشا پرداز اور اہلِ قلم جمع ہوتے اور اپنی دن بھر کی مصروفیتوں پر چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔ ہر بڑے شاعر کا گروہ علیٰحدہ علیٰحدہ اس حوض کے کنارے پر جمع ہوتا ہے اور اسی وجہ سے مشاعروں اور علمی و ادبی مجلسوں میں شاعروں کے ناموں کے ساتھ منسوب ہونے کی جگہ کوئی شمالی حلقہ والا گروہ کہلاتا، کوئی مغربی حلقے والا اور کوئی جنوبی حلقے والا۔ ملّا فیروز کا گروہ اس کے انتقال کے بعد کچھ عرصے تک محمود کے گروہ میں شامل رہا۔ لیکن بعد کو فیروز، محمود اور وجہی یہ تینوں شاعروں کے احباب و تلامذہ ایک ہی حلقے سے منسوب ہو گئے جو وجہی کا یا کٹورا حوض کا مغربی حلقہ کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ملّا وجہی سلطان محمد قلی کے بچپن کا ندیم اور مقرب خاص تھا۔ اس نے تخت نشینی کے بعد اپنے قدیم مقرب کو دربار میں جگہ دی۔ ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا اور بیش قرار تنخواہ مقرر کر کے "قطب مشتری" لکھنے پر مامور کیا۔ یہ کتاب بھاگ متی اور محمد قلی کی باہمی عشق و عاشقی کی بے مثل داستان ہے۔ اور اس کی ترتیب و تصنیف میں بادشاہ کے علاوہ بھاگ متی کے انعام و اکرام اور قدر افزائی کو بھی بڑا دخل تھا۔ وہ اس وقت سلطنت کی سب سے دولتمند شخصیت تھی اور بادشاہی دربار میں جب آتی تو اس کے ساتھ ایک ہزار سوار ہوتے۔

میاں یوسف مصوّر کٹورا حوض کے منڈیر پر بیٹھ گئے اور جیب سے ناس کی ڈبیا نکالتے ہوئے خطاط خاں کو قریب آکر بیٹھنے کا اشارہ کر کے کہنا شروع کیا

"بھائی ملا وجہی کی خوش قسمتی دیکھو۔ کیا زمانہ تھا! تم کو یاد ہوگا یہ مغربی حلقہ سلطان محمد قلی کی زندگی تک کٹورا حوض پر چھایا ہوا تھا۔"

خطاط خاں نے بات کاٹ کر کہا:۔ "ارے میاں میں جانتا ہوں کسی دوسرے کنارے کے حلقے والے وجہی تو کیا اس کے تلامذہ سے آنکھ تک نہیں ملا سکتے تھے"۔

"مگر بھائی اُستاد وجہی بھی تو شروع ہی سے اپنے کمال فن پر ایسے نازاں اور اپنی فضیلت کے اظہار میں ایسے بے باک تھے کہ اکثر نوجوان ان کی مزاجداری سے تنگ آکر مغربی گروہ یعنی ملا غواصی کے حلقے میں شامل ہو جاتے تھے۔ طلعتی کا واقعہ کیا تم کو یاد نہیں"؟ میاں یوسف نے پوچھا۔

"کیوں نہیں؟ یہ اصل میں ملا احمد کا حلقہ تھا جو جنوبی گروہ کہلاتا تھا۔ وہی ملا احمد جنھوں نے یوسف زلیخا لکھی۔ لیکن اس جوانمرگ کے بعد سے یہ حلقہ تمھارے تنک مزاج محلہ وار ملا غواصی کے نام سے مشہور ہوگیا"۔

"ہونا چاہیئے تھا" میاں یوسف نے تیز ہو کر کہا۔ "آپ کے حضرت وجہی نے ملا احمد کے بعد سے کسی مشاعرہ میں جنوبی حلقہ کو تسلیم ہی نہیں کیا اور یہی وجہ تھی کہ میاں غواصی نے اُن کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ اور اگرچہ بادشاہ کے خوف سے مشاعروں میں استاد السلطان کے کلام پر اعتراض نہیں ہوتے تھے لیکن اسی کٹورا حوض کے جنوبی کنارے پر اُن کے اشعار ہمیشہ ہدف ملامت بنے رہے۔ یہاں تک کہ دونوں کے طرفداروں کے آپس میں بعض وقت جھڑپ بھی ہو جاتی۔ ملک خوبی کی کہنی ٹوٹ گئی تھی یاد ہے؟"

"مگر میاں زمانہ کو بدلتے کیا دیر لگتی ہے؟" مصوّر کی پیٹھ پر ہاتھ ٹھوک کر

خطاط خاں نے کہا "ملا وجہی اس حوض کی طرف محمد قلی کی وفات کے بعد سے شاید ہی کبھی آئے ہیں۔ اس لئے بھی غواصی والوں کی ہمتیں بڑھ گئیں۔ اُن کے حلقہ میں روز بروز وسعت ہونے لگی اور رفتہ رفتہ ملا وجہی نے نہ صرف کٹورا حوض پر اپنی جگہ خالی کر دی بلکہ مشاعروں اور دیگر ادبی مجلسوں میں بھی آنا جانا ترک کر دیا۔ آخر تمھارے دوست میاں غواصی کو موقع مل گیا۔ ان کی اہمیت اب سلطان عبداللہ کے زمانے میں اس قدر بڑھ گئی ہے کہ مجبوراً حضرت وجہی کو شاعری بھی ترک کرنی پڑی۔ صرف ایک مشغلہ رہ گیا ہے "سب رس" لکھنے کا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان عبداللہ غواصی کی شاعری کو پسند فرماتے ہیں لیکن اپنے نانا کے وقت کے ملک الشعرا اور مقرب خاص ملا وجہی کی بے وقعتی بھی نہیں کرنا چاہتے۔ بات یہ ہے کہ ملا وجہی کے مقابلے میں میاں غواصی کا چراغ جلنا مشکل تھا۔ وجہی کی ہمہ گیر شخصیت نے گولکنڈہ میں سیکڑوں شاعر پیدا کر دیئے اور یہاں کے ذرہ ذرہ کو آفتاب بنا کر چمکایا۔"

میاں یوسف سنتے رہے پھر چونک کر کہا "یہ تو صحیح ہے۔ محمد قلی عرش آشیانی کے زمانے میں حضرت وجہی کی وجہ سے شاہی محل کے خوشنویس، مصور و نقاش، جلد ساز، مسطر کش، شیرازہ بند، خدمت گار تک شعر و سخن کے ذوق سے سرشار تھے۔ شاہی محل کی ساتوں منزلیں اور ہر منزل میں کام کرنے والے سب کے سب حضرت وجہی کے زیر اثر تھے اور ان میں سے ہر جوہر قابل کو حضرت وجہی نے شاعر بنا دیا تھا۔"

دوسرے بوڑھے نے کہنا شروع کیا:۔ "ارے میاں یہ ملک خوشنود بھی تو انہی کا فیض یافتہ ہے۔ وہ پہلی دفعہ اُن کی بیماری میں ان کی خدمت میں باریاب ہوا اور پھر کچھ ایسا گرویدہ ہو گیا کہ جہاں محل کے کاموں سے فرصت ملتی استاد کے یہاں موجود اور بیجاپور جانے سے قبل تو اس کو شعر و سخن ہی سے کام تھا۔"

یہ دونوں بوڑھے اپنی ختم نہ ہونے والی گفتگو میں محو ہیں۔ انھیں خبر تک نہ ہوئی کہ اس اثناء میں ایک نوجوان قریب آ بیٹھا ہے جو وضع قطع سے درباری معلوم ہوتا ہے۔ اس کو شاعروں کی قدیم نوک جھوک اور ملک خوشنود کے ابتدائی حالات سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق ہے اس لئے ان بوڑھوں کی باتیں سننے ٹھہر گیا۔ جب خطاط خاں نے اپنی تقریر ختم کی تو اس نوجوان کی زبان سے نکلا:۔

"آپ جانتے بھی ہیں ملک خوشنود کو آج بیجاپور اور گولکنڈہ کی سیاسی دنیا میں کیا اہمیت حاصل ہے؟"

اس نئی اور تیز آواز پر یہ دونوں بوڑھے چونک پڑے اور حیران تھے کہ یہ اجنبی کب سے ہماری باتیں سن رہا ہے خطاط خاں نے ترشرو ہو کر کہا "آپ کو ہماری آپس کی باتوں میں دخل دینے کا کیا حق؟ آپ ہیں کون؟ کیسا زمانہ آگیا ہے! نوجوانوں میں نشست و برخواست اور گفتگو کے آداب بھی اب باقی نہ رہے! میں یہ پوچھتا ہوں......"

نوجوان نے دیکھا کہ یہ بوڑھا جھلا گیا ہے۔ نہ معلوم کیا کیا کہہ ڈالے فوراً کہنا شروع کیا۔

"قطع کلام معاف کیجئے مجھے آپنے نہیں پہچانا؟ میں آپکے قدیم دوست دھان کوٹنے والے چاند میاں کا بیٹا ہوں۔"

"ارے تم ہو۔ کیا جوانی تھی تمھارے باپ کی بھی! آج وہ زندہ رہتے تو تم سے اچھے نظر آتے۔ ملک خوشنود کا حال تم کو کیا معلوم تم تو بچے ہو گے، تم نے اُسے دیکھا بھی نہ ہوگا۔"

بوڑھے نے ناس کی ڈبیا کھولتے ہوئے کہا "جی نہیں قبلہ میں اُن سے اچھی طرح واقف ہوں بلکہ ابھی اُن کو حسین ساگر کے قریب چھوڑ آیا ہوں۔"

"کیا وہ اس قدر جلد چلا گیا! بوڑھے نے تعجب سے پوچھا۔

"اس قدر جلد کیا معنی؟ وہ تو کئی مہینے یہاں رہے۔ اس اثنا میں بڑی ہنگامہ آرائیاں رہیں بڑے بڑے مشاعرے ہوئے اور"

"اچھا یہ تو کہو کہ گولکنڈہ کے اس حبشی غلام کو بیجاپور میں اتنی اہمیت کیونکر حاصل ہو گئی۔ تم تو بھاگ نگر ہی میں چوک کے قریب رہتے ہو جہاں شاہی ملازمین کی چہل پہل رہتی ہے تم کو تو معلوم ہوگا" میاں یوسف نے دریافت کیا۔

"کیا آپ حضرات حیدر آباد کی دنیا سے بالکل کورے ہیں؟ اب گولکنڈہ شہر سے اتنا دور ہو گیا! بات یہ ہے کہ جب جلوس بیجاپور جا رہا تھا ملک خوشنود ہمیشہ شہزادی کی زرنگار پالکی کے قریب رہا کرتے تھے اور اثنائے سفر میں انھوں نے ایسی خدمات شائستہ انجام دیں کہ خواجہ سراؤں کے زمرہ میں ممتاز سمجھے جانے لگے اور ملکہ عالمیان خدیجہ سلطان نے ان کی منزلت بڑھا دی۔ بیجاپور پہنچ کر تو ملک خوشنود نے بادشاہ کے مزاج میں ایسی جگہ پیدا کی کہ خود بیجاپور والوں کو رشک آنے لگا۔ چونکہ خدیجہ سلطان شہر بانو بیگم یہاں سے شعر و سخن کا ذوق اپنے ساتھ لے گئی تھیں بیجاپور میں انھوں نے اس کو جاری رکھا اور ملک خوشنود کے ذریعے سے ایک اعلان عام کرایا کہ جو کوئی فارسی کتابوں کے بہترین اُردو ترجمے کر کے ہماری بارگاہ میں پیش کریگا شاہی انعام و اکرام سے مالامال کر دیا جائے گا۔ چنانچہ بیجاپوری شاعروں نے بڑی بڑی اور اعلیٰ پایہ کی کتابیں لکھیں۔ اس مسابقت میں آپ جانتے ہوں گے رستمی کا "خاور نامہ" اول قرار پایا اس کا ایک بہترین باتصویر مجلد نسخہ ملکہ نے اپنے بھائی سلطان عبداللہ کے لئے بیجاپور سے روانہ کیا تھا۔ ملک خوشنود کی کتاب "ہشت بہشت" بھی اسی طرح کے معرکے میں اول آئی تھی۔

آخر کار ملک خوشنود خواجہ سراؤں کے زمرے سے نکل کر شاعروں کے حلقے میں داخل ہو گئے اور ملکہ کی نوازش و عنایاتِ بے پایاں کے باعث بیجاپوری دربار کے

روحِ رواں بن گئے۔ محمد عادل شاہ کو بے وفا خواص خاں کے پنجے سے رہائی دلانے میں بھی ان کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ انہی کی رائے سے سلطان عبداللہ سے مدد طلب کی گئی تھی اور انہی کی تدبیر کے مطابق قطب شاہی فوج نے خواص خاں کو گھیر کر قتل کر ڈالا۔ اس واقعہ سے سلطان محمد عادل شاہ اتنا خوش ہوئے کہ انھوں نے ملک خوشنود کو خاص اعزاز عطا کیا اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کی امداد کا شکریہ ادا کرنے کے لئے انہی کو گراں بہا تحائف و ہدایا کے ساتھ یہاں روانہ کیا تھا۔ چنانچہ ملک خوشنود تین زنجیر فیل، چھ راس اسپ اور متعدد قیمتی تحفوں کے ساتھ جب حیدر آباد کے قریب پہنچے تو حضرت سلطان عبداللہ نے دوسرے سفیروں کے مقابلے میں اُن کی تعظیم و تکریم بہت زیادہ کی اور اپنے خواجہ سراؤں اور امیروں کو ان کے استقبال کے لئے روانہ کیا۔ میں بھی استقبال کرنے والوں میں تھا اور حسین ساگر کے کٹے پر ہم نے اُن کا استقبال کیا۔ ایک وجیہہ امیر کو عالیشان اماری میں بیٹھا دیکھ کر یقین نہیں آسکتا تھا کہ یہی گولکنڈہ کا وہ غلام ہے جو بلقیس زمانی خدیجہ سلطان کی زرنگار پالکی کے ساتھ بیجاپور تک پیدل بھاگتا گیا تھا۔ آج وہی حیدر آبادی غلام بیجاپور کے شاہی ہاتھی پر عالیشان عماری میں سوار اپنے وطن کو واپس آرہا ہے اور یہاں کے بڑے بڑے امراء و معززین اعزاز و احترام کے ساتھ اس کو حیدر آباد لا رہے ہیں۔

شہر میں پہنچنے کے بعد بادشاہ نے ملک خوشنود کو خاصہ سرفراز فرمایا۔ نارائن راؤ مجموعہ دار کی ڈیوڑھی اُن کے قیام کے لئے خالی کرادی گئی۔ اور جب تک وہ حیدر آباد میں مقیم رہے ہر وقت دربار میں ممتاز حیثیت سے شریک ہوتے رہے۔

ملک الشعراء غواصی کو بھی بادشاہ نے حکم دیا تھا کہ حسین ساگر کے کٹے تک جاکر ملک خوشنود کا استقبال کریں لیکن ملک الشعرا کو خیال تھا کہ (ایک تو یہ وہی زرین کمر غلام ہے اور دوسرے ان کے قدیمی رقیب ملا وجہی کے شاگردوں میں سے ہے) ایک ایسے

شخص کے استقبال کے لئے جانا ایک ملک الشعراء کی شان اور اعزاز کے منافی تھا۔ وہ ناسازئ مزاج کا عذر کر کے گھر میں بیٹھ رہے۔ لیکن یہ عذر کب تک۔ بادشاہ نے اپنی ہمشیرہ کے درباری ملک الشعراء، ملک خوشنود کے اعزاز میں ایک عالیشان مشاعرہ ترتیب دینے کا حکم دیا اب ملا غواصی کو لامحالہ گھر سے نکلنا پڑا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ملک خوشنود نے مشاعرے میں اپنی دھاک بٹھادی۔ یوں بھی جب وہ حیدر آباد میں داخل ہونے کے بعد پہلی دفعہ دربار شاہی میں حاضر ہوئے تو بادشاہ کی تعریف میں ایسا قصیدہ پڑھا اور اس خوبی سے پڑھا کہ ان کی آواز اور لب ولہجہ سے سارا دربار محو حیرت ہوگیا۔

غرض اس مشاعرہ کے بعد سے ملا غواصی نے معلوم کر لیا کہ ملک خوشنود صرف ایک زرّین کمر غلام اور وجہی کا معمولی شاگرد ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ شاعر اور قابل قدر مدبر اور سیاس ہے! وہ اس غلام کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔ لیکن خالی رشک کرنے سے کیا ہوتا نہ ملا غواصی ملک خوشنود بن سکتے اور نہ ملک خوشنود' ملا غواصی۔

ایک دن رات میں ملا غواصی ملک خوشنود کی ڈیوڑھی پر پہنچے۔ بیجاپوری خادموں خواجہ سراؤں اور درباریوں کی دنیا ان کے لئے بالکل اجنبی تھی ملک خوشنود اپنی شانِ خواجگی میں جلوہ گر تھے۔ جب اُن کو اطلاع ہوئی کہ قطب شاہی ملک الشعراء اُن کی ملاقات کے لئے آئے ہیں تو انھوں نے آگے بڑھ کر غواصی سے معانقہ کیا ان کی تشریف آوری کو ملک خوشنود اپنی قدر افزائی سمجھتے تھے اور اُدھر غواصی ان کے اخلاق و تعظیم و تکریم سے اس قدر متاثر ہوگئے تھے کہ انھوں نے تخلیہ میں ملک خوشنود کے استقبال کے معاملہ میں معافی چاہی۔ بوڑھے ملک الشعراء اور اپنے استاد کے حریفِ مقابل کی اس تقریر کا خوشنود پر بڑا اثر ہوا انھوں نے کہا۔

"آج آپ کی اس زحمت فرمائی اور عزت افزائی کا ممنون ہوں اور متمنّی ہوں کہ آپ بیجاپور چلنے کی دعوت قبول کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ

آپ بھی میری طرح سلطنت کی سفارت کی خدمات انجام دیں اور میرے ساتھ
گولکنڈہ کے سفیر کی حیثیت سے بیجاپور چلیں ۔ انشاء اللہ وہاں آپ اسی طرح
اعزاز واکرام اور شاہی انعام ونوازشات سے مالامال ہوں گے جس طرح
میں گولکنڈہ میں بہرہ ور ہوا ۔"

بوڑھے غواصی کے لئے یہ دعوت مژدۂ روح پرور تھی ۔ وہ راضی ہو گئے مگر انھیں یقین نہیں تھا کہ ہمارے ملک کے امراء اور خود بادشاہ سلامت اس کو منظور کریں گے ۔ ملک خوشنود کے لئے اجازت حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا ۔ آخر وہ دن آ ہی گیا کہ نوجوان ملک خوشنود کے ساتھ بوڑھے ملک الشعراء ملا غواصی بڑے تزک واحتشام اور بیش بہا تحائف کے ساتھ گولکنڈہ کے سفیر کی حیثیت سے بادشاہ کی طرف سے محمد عادل شاہ کی کامیابی پر مبارکباد اور تہنیت ادا کرنے کی غرض سے جانب بیجاپور روانہ ہوئے ۔ اور گولکنڈہ اور بھاگ نگر کے امراء شرفاء اور صاحبانِ علم وفضل حیران ہیں کہ کیا آئندہ سے سفارت کا کام بھی اُردو شاعروں ہی کے تفویض کر دیا جائے گا ! یہی ایک خدمت بچ رہی تھی جس پر گولکنڈہ اور بیجاپور کے اُردو شاعر اپنا قبضہ نہ کر سکے تھے ورنہ ان شاہی درباروں میں ترقی پانے کے لئے شعروسخن کا ذوق یک گونہ لازمی ہو گیا تھا ۔

شہزادی کا عقد

سنہ ۱۰۶۵ھ

سلطان عبداللہ قطب شاہ بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کے بڑے معتقد ہیں۔ آئے دن کسی نہ کسی بزرگ کی زیارت کے لئے نکلتے ہیں، اور ہر صاحب باطن سے یہی التجا ہے کہ ایک ایسے فرزند کے لئے دعا کریں جو اُن کے بعد قطب شاہی تخت و تاج کا وارث اور حکمرانی کا اہل ہو۔

شاہ نعمت اللہ کی سرائے حیدرآباد میں بہت مشہور ہے۔ یہ اس شاہراہ عام پر واقع ہے جو گولکنڈہ سے چار مینار کو آتی ہے۔ اس کے قریب گلبرگہ کے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ؒ کے پڑپوتے حضرت شاہ راجو بیجاپور سے تشریف لا کر قیام پذیر ہیں۔ ان کے اخلاق ظاہری اور فیوض باطنی، دور دور تک مشہور ہو چکے ہیں ایک امیر نے ان کے قیام کے لئے وہیں ایک خانقاہ یا مکان تعمیر کر دیا جس کا دروازہ دن میں ہر وقت بند رہتا ہے اور جب شام کو کھلتا ہے تو خلق اللہ کے اژدہام کی وجہ سے جگہ ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ امیر و غریب سب زمین بوس ہوتے ہیں نذر گزرانتے ہیں اور حضرت کی برکات سے فیض یاب ہو کر واپس ہوتے ہیں۔

سلطان عبداللہ بھی اس بارگاہ میں کئی بار حاضری دے چکے ہیں۔ ایک دفعہ وہ شرف نیاز حاصل کر کے واپس ہو رہے تھے کہ ایک قبول صورت نوجوان پہ چیتھڑے لگائے ہوئے نظر پڑتا ہے اس پر نظر پڑتے ہی حضرت شاہ راجو ؒ نے جو کم بولتے تھے زور سے نعرہ لگایا۔

"دیکھنا ایک بادشاہ گیا اور دوسرا بادشاہ آیا"

حاضرین میں بڑے سے بڑے امیر اور محتاج سے محتاج فقیر سب ہی شامل ہیں اور یہ سب حیران ہیں کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ حضرت نے اس غریب نوجوان کو صحن جھاڑنے کی

خدمت سپرد کی۔ مثل مشہور ہے جتنے منہ اتنی باتیں، ہر شخص شاہ صاحب کی بارگاہ سے واپس ہوتے وقت آج شام کے واقعہ پر کچھ نہ کچھ تبصرہ کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ "آج کا حضرت کا ارشادِ مبارک سمجھ میں نہ آیا"

دوسرے نے نہایت سنجیدگی سے کہا:۔"جناب یہ ایک پیشین گوئی معلوم ہوتی ہے"

تیسرا کہتا ہے:۔"رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند۔ حضرت اس ملک کے قطب ہیں جس کو چاہیں بادشاہ بنا دیں"۔

ایک بدعقیدہ نوجوان نے اس گفتگو میں یوں دخل دیا:۔"اس افلاسی سے تو میں ہی بہتر تھا مجھے کیوں نہیں بادشاہ بنا دیتے!"

ایک بڈھے نے ہتھیار سنبھالتے ہوئے اس کی طرف پلٹ کر ڈانٹا:۔

"اگر اب کے حضرت قبلہ کی شان میں ایسی گستاخی کی تو سر اڑادونگا تو کیا جانتا ہے؟ کل کا بچہ اور اتنی بڑی باتیں! کیا اب مدرسوں میں ایسی ہی بے ادبیاں سکھائی جاتی ہیں؟ کیا اہل شہر میں سنجیدگی اور متانت باقی نہیں رہی"

۴

سلطان عبداللہ کی تیسری صاحبزادی کے عقد کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ایک عرصے کے بعد پھر قلعے اور شہر میں آرائش و تزئین کی گرم بازاری ہے ہر طرف دھوم دھام ہے۔ تمام امرائے دربار بھی اپنے اپنے محلوں اور باغوں کو رشکِ فردوس بنانے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

نوشہ بننے والے سید سلطان کو حسینی علم کے قریب ایک عالیشان حویلی میں اتارا گیا ہے جیسے جیسے عقد کی تاریخ قریب آرہی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف سارا قلعہ اور شہر بلکہ تمام صوبہ جات اور اضلاع کے خوش باش تماش بین نوشہ کے قصر سے قلعہ کے دولت خانۂ عالی تک کی

درمیانی سڑک کے دونوں جانب کھینچ کر آ گئے ہیں۔ تین چار میل کا راستہ خیموں، شامیانوں اور آراستہ مکانوں سے معمور ہے۔ راستہ کی تمام دکانیں اور ان کے بالاخانے معمول سے کئی چند زیادہ کرایوں پر صرف دو ہفتوں کے لئے حاصل کر لئے گئے ہیں اور ہر صاحبِ ثروت کی یہی خواہش ہے کہ اپنے ہم چشموں سے بڑھ کر اس شاہی تقریب کے تمام رسومات اور نوشہ کے شب گشت و بازگشت کے جلوس کے مناظر سے لطف اندوز ہو سکوں، بالاخانوں، خیموں اور شامیانوں کے عقب میں جہاں کہیں جگہ ملی بڑے بڑے بازار قائم ہو گئے ہیں کسی کا دل نہیں چاہتا کہ شاہی برات کے راستے کی گوناگوں دلچسپیاں چھوڑ کر روزمرہ کی چیزیں خریدنے کے لئے بھی دور دراز بازاروں کا رُخ کرے۔

ہزاروں آدمی ہیں کہ کئی دن سے اسی سڑک کے آس پاس تماشہ بینی میں منہمک ہیں دن کے وقت زرق برق لباس پہنے ہوئے شاہی خدام کا طرح طرح سے سجے ہوئے ہاتھیوں اور اونٹوں اور گھوڑوں پر قلعہ سے شہر اور شہر سے قلعہ کو آنا جانا، ہر ہاتھی اور اونٹ کی جداگانہ آرائش و زیبائش، امیروں کے ہاتھیوں پر قسم قسم کی وضع قطع کی روپہلی اور سنہری عماریوں کا دھوپ میں جگمگانا، اور نقالوں اور بھانڈوں کے حیرت انگیز کرتب، اور رات میں طرح طرح کے رنگ اور زہرہ جبیں طوائف کے ناچ اور گانے غرض مسلسل چوبیس گھنٹے گوناگوں دلچسپیوں کا ایک متلاطم دریا ہے کہ بہا چلا جا رہا ہے۔

۲

دیکھتے دیکھتے ساچق کا دن آ گیا، اور در اصل اسی رسم سے شادی اور اس کی دلچسپیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے شاہی فوجوں کا جلوس، طرح طرح کے باجوں کا ہنگامہ اور پھر سیکڑوں نازک اندام اور شوق وشنگ کا ماتنوں کے سر پر ساچق کی رنگا رنگ ٹھلیوں کا، قلعہ سے شہر کی طرف جانا ایک ایسا سماں پیدا کر رہا تھا جس کو زبانِ قلم سے بیان کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ جہاں تک نظر دوڑتی ہے یہی رنگیں سبوچے قطار در قطار (سر پر لئے چلنے والیوں کی مستانہ رفتار کے ساتھ) ایک ذخار سمندر کی مست موجوں کی طرح حرکت کرتے اور آگے کو بڑھتے

نظر آتے تھے۔

اِدھر تو شاہراہ کے دونوں طرف گولکنڈہ اور حیدرآباد کی ساری خلقت ساچق کا جلوس دیکھنے میں مشغول ہے اور اُدھر صحن خانقاہ میں حضرت شاہ راجو رح کے معتقدین و فقراء مٹی کے آبخوروں اور وضو کے لوٹوں پر رنگ برنگ کی لکیریں کھینچ کر اور لال پیلے کاغذ چپکا کر اپنے ہاتھوں اور سروں پر لیے ہوئے گشت لگا رہے ہیں، کیونکہ شاہ صاحب اپنے دیرینہ خادم ابوالحسن کا رسم ساچق منانا چاہتے ہیں۔ یہ وہی ابوالحسن ہے جس کو آتا دیکھ کر کئی سال قبل شاہ صاحب نے کہا تھا کہ:۔

"ایک بادشاہ آیا"

اسی طرح جس روز شاہی محلات میں مہندی کے رسوم ادا کئے گئے حضرت شاہ راجو رح نے ٹہلتے ٹہلتے ابوالحسن کو جو وہیں صحن کی صفائی میں مصروف تھا نزدیک بلایا اور اس کی انگلیوں پر قریبی درخت کے چند پتے توڑ کر مہندی کی طرح لگا دیئے۔

۴

شہر کی مخلوق اور حضرت شاہ راجو رح کے مریدین و معتقدین سب اپنی اپنی دلچسپیوں میں محو ہیں، اور کسی کو اس حیرت ناک ڈرامے کی خبر نہیں جو ان کی نظروں سے اوجھل بالاحصار کی اندرونی فصیلوں میں شاہی محل میں کھیلا جا رہا ہے۔

اس ڈرامے کا سب سے دلچسپ اور عروجی حصہ وہ تھا جب دلہن، اس کی بڑی بہن اس کی ماں، اور بادشاہ کا بڑا داماد سید احمد چاروں اپنی اپنی جگہ خنجر ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئے کہ "جہاں یہ دولہا دیوان خانے میں داخل ہوا اور ہم سبھوں نے اپنا اپنا خاتمہ کر لیا"۔ بادشاہ تک اس تشویش ناک واقعہ کی خبر پہنچی۔ وہ اپنے بڑے داماد سید احمد اور ہونے والے داماد سید سلطان کی اچانک باہمی مخالفت سے واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ ان کی بڑی لڑکی اور اس کا داماد اور ان دونوں کے اثر سے خود ملکہ اس رشتہ سے ناراض ہیں، لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ معاملہ

اس قدر نازک ہو جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ گزشتہ رات میں ملکہ کی مخالفت، اور سید احمد کے اعتراض پر انھوں نے غصّہ میں کہدیا تھا کہ :-

"سید احمد میری لڑکی کا مالک نہیں ہے کہ جس سے چاہے رشتہ کرے اور جس سے چاہے توڑ دے میں باپ ہوں میرا فیصلہ قطعی ہے کہ چھوٹی لڑکی کا عقد سید سلطان ہی سے ہوگا"

اب جو بادشاہ محل میں پہنچ کر حقیقتِ حال سے واقف ہوئے تو انھیں کچھ سجھائی نہ دیا۔ انھوں نے فوراً حضرت شاہ راجوؒ سے مشورہ لیا جنھوں نے اس نازک گتھی کو سلجھانے کے لئے اپنے دیرینہ معتقد کو بحیثیت نوشہ پیش کیا۔ خوش قسمت ابوالحسن اتفاق سے ملکہ کا دور کا رشتہ دار بھی تھا سب رضامند ہو گئے۔

اسی وقت یہ غریب جس کو شاہ راجوؒ کی خدمت کرتے کرتے چودہ سال گزر چکے تھے اور جس نے فقر و فاقہ کے جملہ مسالک طے کر لئے تھے محل کے اندر پہنچایا گیا محل کے شاہی حمام میں اس درویش کا شاہانہ حمام ہوا، شاہی خدّام نے عروسی جوڑا جس میں اعلیٰ جواہرات ٹنکے ہوئے تھے پہنایا اور مروارید کا زرتار سہرا باندھ کر دیوانخانہ میں پہنچایا۔ قلعہ کے شریعت پناہ اور شہر کے علما و فضلا جمع تھے فوراً رسمِ عقد ادا کر دی گئی۔ ارکانِ دولت اور امرائے عظام نے تہنیت کی نذریں گزرانیں، اور خطبۂ نکاح کے ساتھ ہی بالاحصار کے توپچیوں نے مبارک باد کی شادیانے توپیں سر کیں۔

ادھر شہر سے گولکنڈہ آنے والی سڑک پر شب گشت کا جلوس دیکھنے کیلئے رات ہی سے خلقت کا اژدحام تھا۔ سید سلطان تیار ہو کر لباس عروسی زیب تن کئے شب گشت کیلئے گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا کہ بالاحصار سے توپوں کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ وہ اور اسکے ساتھ لاکھوں آدمی حیران تھے کہ یہ بے وقت توپوں کی آوازیں کیسی؟ تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہو گیا کہ قلعہ میں شاہ راجوؒ کے ایک غریب مرید ابوالحسن کے ساتھ شہزادی کا عقد ہو چکا ہے۔ سید سلطان اسی لباسِ عروسی میں شب گشت کے آراستہ و پیراستہ گھوڑے پر حیدرآباد سے بھاگا اور سیدھا شہزادہ اورنگ زیب کے یہاں پہنچ گیا جو اس وقت شہر اورنگ آباد کی آبادی اور آرایش میں مصروف تھا۔

کوہ نور

سنہ ۱۰۶۶ھ

ہیروں کا معدن، ہیرے کی کان، ہیرے کی منڈی۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو کسی زمانہ میں گولکنڈہ کے مترادف سمجھے جاتے تھے۔ قطب شاہی سلطنت فولاد اور زہر مہرے کے علاوہ ہیروں کا بھی مخزن تھی۔ کوہ نور جو زمانہ کے بڑے بڑے انقلابات سے گزرنے کے بعد آج انگلستان کے شاہی تاج کی زیب و زینت ہے اسی سلطنت کی ایک کان سے نکلا تھا۔

گولکنڈہ کا لوہا بہت مشہور تھا۔ یہاں کے فولاد سے سمرقندی تلواریں تیار ہوتی تھیں۔ یہیں سے فولاد فارس اور پنجاب کو تلواریں بنانے کے لئے جاتا تھا۔ خود گولکنڈہ کے قریب نرمل اور اندور میں یہیں کے فولاد سے عمدہ تلواریں اور خنجر اس کثرت سے بنائے جاتے تھے کہ قطب شاہی افواج کی سربراہی کے بعد بھی بچ رہتے اور اقصائے ہندوستان کے اسلحہ خانوں کے لئے روانہ کئے جاتے۔ زہر مہرہ کی بکریاں ہزاروں کی تعداد میں اسی قلعہ کے اطراف و اکناف نیز سلطنت کے شمال مشرق کی پہاڑیوں میں پرورش پاتی تھیں اور خاص کر اُن میں خاص اہتمام سے پالی جاتی تھیں جو اب بنجارہ ہل کے نام سے موسوم ہیں اور حیدرآباد کے متمول طبقہ کی قیام گاہ ہے۔ ایک ایک بکری میں کئی کئی زہر مہرے نکلتے تھے۔ مشہور سیاح ٹیورنیر نے یہاں کا ایک زہر مہرہ تین ہزار روپیہ میں فروخت کیا تھا

اور اپنی ابتدائی سیاحتوں کے دوران میں گولکنڈہ کے عیسائی باشندوں کے ملازمین سے تقریباً ساٹھ ہزار کا زہر مہرہ خریدا تھا۔ بعض تاجر جو اس کی فروخت کا گتہ لیا کرتے تھے بادشاہ کو سالانہ چھ ہزار اشرفیاں یا بینتالیس ہزار لیور معاوضہ دیا کرتے تھے۔ اور ان کو حکم تھا کہ زہر مہرہ کی بکریوں کو فروخت نہ کریں۔ اگر کوئی شخص کسی بکری کو قطب شاہی علاقہ کے باہر لے جاتا تو وہ مستوجب سزائے قتل قرار دیا جاتا۔

ہیرا تمام جواہرت میں سب سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ گولکنڈہ دنیا کے ہر خطہ کے جواہر فروشوں کا آماجگاہ تھا کیونکہ اس وقت صرف سرزمین دکن ہی تمام دنیا کے لئے ہیرے فراہم کرتی تھی ابھی اور کہیں ہیروں کی کانوں کا پتہ نہ لگا تھا ہیروں کی تلاش میں ایران وتوران اور مصر وچین کے لکھ پتی تاجروں کے علاوہ، یورپ کے بھی متعدد متلاشی مثلاً فریڈرک، متھیولڈ، برنیر، ٹیورنیر اور تھیونو وغیرہ بارہا گولکنڈہ آچکے تھے اور ایک ایک شخص ہر وہلہ میں تین تین چار چار لاکھ کے قیمتی ہیرے خرید کر لیجاتا تھا۔ ٹیورنیر یہاں کی کانوں کے سلسلہ میں لکھتا ہے :۔

> "اہل یورپ میں سے میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے ان کانوں تک فرنگیوں کا راستہ کھولا ہے اور وہ مقام ان کو بتادیئے جس کے سوا تمام دنیا میں کہیں سے ہیرا نہیں نکلتا"۔

گولکنڈہ کے ہیرے کی ایک ایک کان میں ساٹھ ساٹھ ہزار آدمی مصروف کار رہتے۔ اُن کی فروخت پر بادشاہ کو صرف دو فیصدی حق مالکانہ دیا جاتا تھا جس سے خزانۂ شاہی کو چوبیس لاکھ روپیہ سالانہ سے زیادہ کی آمدنی ہوجاتی تھی۔ یہ تو

فروخت کا معاملہ تھا۔ جو ہیرے خود بادشاہ سلامت کے لئے نکالے جاتے ان کی قیمت کا اندازہ ناممکن ہے۔

ان ہیروں نے جہاں گولکنڈہ کی قسمت کو بنادیا اور قطب شاہیوں کو دولتمندی کے انتہائی عروج پر پہنچا دیا انہی کی وجہ سے ان کو پریشانیوں میں بھی مبتلا ہونا پڑا۔ اور رفتہ رفتہ ان رفیع المرتبت قطب شاہوں کو اپنی سلطنت سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ دولت حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا اس کی حفاظت مشکل ہے۔ تاجروں اور جان نثاروں کے ساتھ گولکنڈہ کے محلات اور بازاروں میں ایسے بدمعاملی اور خودغرضوں کی بھی آمدورفت شروع ہوئی جن کا مقصد محض حصول زر تھا اور جن کی تمنا یہی تھی کہ جس طرح بن پڑے دولت سمیٹیں۔ اس مقصد کے حاصل کرنے میں انھوں نے ایسے طریقے بھی اختیار کرنے شروع کئے جو سلطنت کے داب و تنظیم، امیروں اور کارپردازوں کے اخلاق و عادات، اور رعایا کے امن و امان میں خلل ڈالنے کا باعث ہوئے۔ سعی و سفارش، لوٹ مار، فریب وریا غرض کوئی فعل ایسا نہ تھا جس سے ان لالچیوں نے کام نہ لیا ہو۔

انہی ہوس رانوں میں محمد سعید اردستانی اصفہانی کا نام گولکنڈہ میں رہنے اور حیدرآباد میں بسنے والوں کے دل سے کبھی محو نہ ہو سکے گا۔ یہ وہ احسان ناشناس شخص ہے جو حیدرآباد کی دولت سے ایک ٹوٹ پونجیے سے لکھ پتی اور محمد سعید سے وزیر اعظم میر جملہ بن گیا اور اپنے محسنوں کو اور اس ملک کو جس کی بدولت اس کو دولت ملی برباد و تباہ کر کے چھوڑا۔ گولکنڈہ کی تاریخ میں اُس کا نام ہمیشہ کے لئے ایک بدنما داغ رہے گا۔ اور آنے والی دنیا اس کو لالچی، احسان فراموش اور محسن کش جیسے ناموں سے یاد کرے گی۔

اس عجیب و غریب شخصیت کے متعلق ہم کو اُس وقت تفصیلی معلومات حاصل ہوئیں جب ہم قلعہ میں میر جملہ کی بارہ دری اور ہاتھی باؤلی کی سیر میں منہمک تھے وہاں ہمارے رہنما نے ہم سے کہنا شروع کیا :۔

محمد سعید اردستان کے ایک تیلی کا بیٹا تھا۔ اور محمد قلی کے زمانہ میں ایک ایرانی جوہری کے معمولی ملازم کی حیثیت سے گولکنڈے آیا۔ یہاں اس کی طماع فطرت نے جوہری کے کاروبار کی وسعت، اس کے یہاں ہیروں کی فراوانی اور مال ودولت کی کثرت دیکھ کر اپنے آقا کے قتل پر اس کو ابھارا چنانچہ کچھ ہی عرصہ میں ایسی ترکیب کی کہ جوہری مردہ پایا گیا اور محمد سعید اپنے آقا کی دولت و ثروت کا مالک اور ایک متمول تاجر بن گیا۔ لیکن وہ محض تاجر کی حیثیت پر کیونکر قانع ہوسکتا تھا۔ وہ گولکنڈہ میں بیدر کے ملک التجار محمود گاوان کا قصہ سُن چکا تھا۔ اس نے شاہی ملازمین اور درباریوں کے ساتھ ایسا ساز باز کیا کہ قطب شاہی سلطنت میں اس کو بہت جلد ایک عہدہ بھی حاصل ہوگیا۔ غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ گولکنڈہ کے امیر رشوت لینے پر مجبور ہوگئے تھے۔ محمد سعید سمجھتا تھا کہ یہ خدمت عہدۂ صدر اعظمی اور میر جملگی کی طرف پہلا قدم ہے اور ظاہر ہے کہ پہلا قدم ہی مشکل سے اٹھتا ہے۔ اس دشوار راہ کو اُس نے خوشامد، رشوت، اور سازشوں کے ذریعہ بہت آسانی سے طے کرلیا۔ لیکن بُرائی ایک وقت ظاہر اور حق باطل پر غالب ہو کر ہی رہتا ہے آخر چال بازیوں کی قلعی کھل گئی اور اس کو گولکنڈہ چھوڑنا ہی پڑا۔

عرصہ تک غائب رہنے کے بعد نوعمر سلطان عبداللہ میرزا کے عہد حکومت میں وہ پھر گولکنڈہ کے دربار میں نظر آنے لگا۔ اور چند ہی روز میں اس دربار میں بھی ایسی عزت و رسوخ حاصل کرلیا کہ بادشاہ نے میر جملہ اور امیر الملک جیسے رفیع الشان

خطابات اور سپہ سالاری اور صدر اعظمی کے جلیل المرتبت خدمات عطا کئے لیکن کم عمر اور نیک دل بادشاہ کو کیا خبر تھی کہ جس شخص کو یہ اعزاز بخشا جا رہا ہے وہ اس کا اہل بھی ہے یا نہیں؟

محمد سعید کی حرص کے آگے میر جملگی اور صدر اعظمی جیسے جلیل القدر عہدے ہیچ تھے وہ اب بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا، بریدیوں کی مثال ہر وقت اس کے پیش نظر تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ بہمنیوں کا خاتمہ کس آسانی سے ہو گیا تھا، علاء الدین حسن گنگو محمد شاہ بہمنی اور احمد شاہ ولی جیسے پرشکوہ و عظمت حکمرانوں کے جانشینوں اور ان کے محلات کو معمولی خدمت گاروں نے کس طرح ذلیل اور سلطنت سے محروم کیا تھا۔ وہ اس وقت ان سے زیادہ طاقتور تھا لیکن جانتا تھا کہ محسن کش بریدی شایان شان اقتدار و دولت حاصل کئے بغیر بیدر کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیکر زیادہ عرصہ تک اس کو سنبھال نہ سکے اس لئے وہ اپنے اثر و اقتدار اور مال و دولت میں اور بھی اضافہ کرنے کے جائز و ناجائز وسیلے ڈھونڈھنے کی فکر میں لگ گیا۔

اس اثنا میں میر جملہ نے گولکنڈہ پر اتنا اثر جما لیا تھا کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی غیر شخص بادشاہ سے نہیں مل سکتا تھا۔ اس کی رائے و مشورہ کے بغیر تاجروں کا مال و اسباب خریدنا تو کجا دیگر بادشاہوں کے تحفہ و تحائف بھی قبول نہیں کئے جا سکتے تھے۔ وہ اپنے گمراہ و عیاش بیٹے محمد امین کو گولکنڈہ کے دربار میں اپنا جانشین مقرر کر کے دولت و اقتدار کے اضافہ کے لئے گولکنڈہ سے باہر نکلا۔ بادشاہ اور اس کے طرفداروں کو اس نے اس کی یہ وجہ بتائی کہ قطب شاہی سلطنت میں اضافہ کرنے کے لئے اس سفر کی ضرورت ہے لیکن اس کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ اس کے جاسوس ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ گولکنڈہ کے در و دیوار بھی اس کے مخبر تھے۔ بادشاہ اور ملکہ کی پوشیدہ سے پوشیدہ

باتوں کا تک اس کو علم ہو جاتا تھا لیکن اس کی بڑی سے بڑی سازش اور بے ایمانی ان سے چھپی رہتی۔ اس کے ملازمین اور ہوا خواہ اس کی ہر نازیبا حرکت کو حسن کے پیرایہ میں بادشاہ کے سامنے بیان کرتے۔ اُس نے علاقہ کرناٹک میں قتل و غارت اور بے دردی کا ریکارڈ توڑ دیا۔ بادشاہ کی نظر میں اس کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ اُس نے قطب شاہوں کی قدیم روایات اور صریح شاہی احکام کے خلاف مندروں کو لوٹنا شروع کیا، کسی مذہبی، سیاسی خیال سے نہیں بلکہ ان کی بے شمار دولت پر قبضہ کرنے کے لئے۔ اس نے ہیروں کی کانوں پر اپنا قبضہ کر لیا اور نہ صرف بادشاہ کے دو فیصدی حقوق مالکانہ کو سلب کر دیا بلکہ بڑے بڑے نایاب ہیروں کو بھی بادشاہ کے یہاں بھجوانے کے عوض اپنے ذاتی خزانہ میں داخل کر لیا۔ دوسروں کے نام سے ہیروں کی کانوں کا خود ٹھیکہ لے لیا۔ بادشاہ کی اجازت کے بغیر ہیروں کی کئی کانیں خود کھدوائیں اور بارہ بارہ پندرہ پندرہ ہزار غریبوں کو کھیتی باڑی کے کاموں سے چھڑا کر اپنی کانوں کے کام میں لگا دیا اور اس طرح زراعت کو نقصان پہنچایا۔ اپنی ذات کے لئے علٰحدہ لشکر جمع کرنا شروع کیا۔ فرنگیوں کی ایک جداگانہ فوج اپنے یہاں نوکر رکھی۔ یہ سب کام بادشاہ کی نگاہ سے کب تک چھپ سکتے تھے۔ جلوخانۂ عالی میں غریب ہندو رعایا کی ٹکڑیاں دور دور سے دادخواہی کے لئے آنے لگیں اور ہر طرف ملک میں اُدھم مچ گئی۔

ایک روز بادشاہ گولکنڈہ سے حیدرآباد جا رہے تھے، راستہ میں کاروان ساہواں کے قریب ایک تباہ حال غریب بادشاہ کے گھوڑے کے سامنے گر پڑا۔ بادشاہ نے گھوڑا روک کر دریافت کیا تو اس غریب نے ایک عجیب و غریب بہت ہی بڑا ہیرا اندر دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک مشہور جوہری ہے جس نے کولور کی کان میں

ہیروں کا ٹھیکہ لیا تھا۔ یہ مقام گولکنڈہ سے ۷۶ میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں کچھ دنوں قبل چند بہت بڑے اور غیر معمولی وزن و آب و تاب کے ہیرے نکلے تھے جن میں سے ایک وہ ہیرا بھی تھا جس کا نام بعد میں کوہ نور مشہور ہوگیا۔ ایسے ہیرے ٹھیکہ دار ہمیشہ بادشاہوں کے یہاں لایا کرتے تھے۔ لیکن میر جملہ نے سب ہیرے زبردستی چھین لیے۔ جوہری آنکھ بچا کر ایک ہیرا جوں کا توں نگل گیا اور بعد میں اس کو نکال لیا تاکہ بادشاہ کو لے جا کر دکھائے اور حقیقت حال سے واقف کرے۔

بادشاہ یہ واقعہ سنکر خشمگیں ہوگئے۔ انھوں نے فوراً میر جملہ کے یہاں کہلا بھیجا کہ وہ سب ہیرے لیکر حاضر ہو۔ اسی طرح میر جملہ کے بیٹے محمد امین سے بھی نازیبا حرکتیں سرزد ہو رہی تھیں۔ لیکن بادشاہ کو یا تو اُن کا علم نہیں ہونے پاتا تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ اپنی فطرتی نیک دلی کی بناء پر درگذر کر جاتے تھے۔ اب جو سب کو معلوم ہوا کہ میر جملہ سے بادشاہ ناراض ہوگئے ہیں تو گوشہ گوشہ سے شکایتیں پہنچنے لگیں۔ کسی نے عرض کیا "حضور تین مہینے ہوئے۔ حسین شاہ ولی صاحب کی درگاہ میں مینا بازار بھرا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا بھیس بدل کر محمد امین اپنی چند خواصوں کے ساتھ اس میں شریک ہوا۔ اور دو حسین لڑکیوں کو جن کی شادی ہو کر صرف دو ہفتے ہوئے تھے راستہ سے پکڑ لے گیا۔" دوسرے نے کہا "سرکار میرے آدمی ہاتھی کو ندی میں نہلانے کے لئے جا رہے تھے اتفاق سے محمد امین اس طرف سے گذرا۔ میرے ملاز میں کی صرف اتنی خطا تھی کہ ہاتھی کو راستہ سے جلد نہ ہٹا سکے۔ اس نے غصہ میں آکر دونوں کو مار ڈالا۔" شکایتوں کی انتہا نہ تھی۔ یہانتک کہ بادشاہ کے فرنگی طبیب نے بھی ایک روز دست بستہ عرض کیا:۔

"حضور کئی ماہ سے ٹیورنر اور دو ثوردین کا قافلہ جواہرات لئے ہوئے

گولکنڈہ آیا ہے تاکہ بندگان عالی کے ملاحظہ میں پیش کریں۔ نگران سے کہا گیا کہ جب تک میر جملہ نہ دیکھ لے بادشاہ کی خدمت میں تم لوگ باریاب نہیں ہو سکتے۔ مجبوراً وہ سب گولکنڈہ سے گنڈی کوٹ چلا گئے جہاں میر جملہ عرصہ سے ہیروں کی تلاش میں قیام پذیر ہے۔ کئی دن تک اس کے خیمہ گاہ پر حاضری دی اور بڑی مشکل سے باریابی نصیب ہوی اس نے کئی دفعہ پھرانے کے بعد جواب دیا کہ گولکنڈہ میں محمد امین سے جاکر لو وہ تمھیں بادشاہ سے ملا دیگا۔ وہ لوگ اب ایک مہینہ سے گولکنڈہ میں ہیں روز محمد امین کی ڈیوڑھی میں حاضری دے رہے ہیں مگر وہ دربار سے آکر سیدھا حرم سرا میں گھس جاتا ہے اور پھر دنوں باہر نہیں نکلتا۔ یہی فرنگی بیان کرتے ہیں کہ شاہ ایران نے پچپن گھوڑے بطور تحفہ آپ کی خدمت میں روانہ کئے تھے وہ گھوڑے حیدرآباد آئے مگر یہیں آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جگہ میر جملہ کے کارپردازوں نے اُن کو گنڈی کوٹ روانہ کیا تاکہ وہ پہلے دیکھ لے۔ یہ گھوڑے بھی حیدرآباد سے تاجروں کے قافلہ کے ساتھ وہاں پہنچے۔ اثنائے سفر میں پانچ گھوڑے مرگئے اور جو زندہ ہیں اب تک میر جملہ کے اصطبل میں موجود ہیں۔"

ان خبروں سے بادشاہ پریشان ہوگئے۔ انھوں نے دربار میں محمد امین سے دریافت کیا۔ وہ گستاخانہ جوابات دینے لگا۔ بادشاہ غصہ میں اٹھ کھڑے ہوئے اور محل کی طرف بڑھے۔ بادشاہ کا اشارہ پاکر جاں نثاروں نے اس کی خوب ہی خبر لی اور نہایت ذلت کے ساتھ دربار سے باہر نکال دیا۔

یہ ایک معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اُسی وقت تمام ملک میں یہ خبر مشہور ہوگئی۔ میر جملہ نے اپنے انجام کو تاڑ لیا۔ اس نے دیکھا کہ اب ہیروں کو بچانا بھی آسان نہیں ہے۔ اُس نے فوراً شہزادہ شجاع کو جو اس وقت شاہجہاں کی طرف سے بنگالہ کا

گورنر تھا عریضہ لکھا کہ آپ اپنی فوج کے ساتھ گولکنڈہ کا رخ کیجئے۔ وہاں کی تمام فوج میرے ساتھ ہے۔ کوئی مقابلہ کرنے والا نہیں۔ مفت میں آپ اس سلطنت کے بادشاہ ہو جائیں گے۔ شہزادہ شجاع نے جواب دیا کہ :-

"جو شخص اپنے محسن اور آقا سے غداری کرنے پر آمادہ ہو اُس کی رائے اور اعانت پر بھروسہ کرنا عقلمندوں کا شیوہ نہیں، آج تم سلطان عبداللہ جیسے نیک دل حکمران کے ساتھ بے ایمانی کرنا چاہتے ہو کل میرے ساتھ بے ایمانی کرنے میں کیا کمی کرو گے"؟

وہاں سے ناامید ہو کر میر جملہ نے شہزادہ اورنگ زیب کو خط لکھا جو اس وقت اورنگ آباد کا صوبہ دار تھا۔ اورنگ زیب ایسے بے ایمان کے ساتھ معاملہ کرنا جانتے تھے انھوں نے فوراً منظور کر لیا۔ میر جملہ نے رائے دی کہ آپ علی الاعلان حملہ نہ کریں چونکہ اورنگ آباد سے بنگالہ کو جانے کا راستہ بھاگ نگر ہی سے گذرتا ہے آپ یہ مشہور کیجئے کہ آپ کا فرزند شہزادہ محمد سلطان اپنے چچا شہزادہ شجاع کی لڑکی سے شادی کرنے جا رہا ہے۔ اِدھر میر جملہ نے سلطان عبداللہ کو لکھا میں ہیرے لیکر حاضر خدمت ہو رہا ہوں مگر شاید دیر لگے اس اثنا میں شہزادہ محمد سلطان بھاگ نگر کے قریب سے گذرے گا آپ اس کی شایان شان دعوت کریں تو فریقین میں ازدیاد محبت اور استحکام تعلقات کا باعث ہوگا۔

حیدرآباد میں شہزادہ کی دعوت کی عالی شان تیاریاں ہونے لگیں۔ تمام محلات شاہی کو آراستہ کیا گیا اور راستوں کی زیب و زینت کے لئے پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا۔ شہزادہ کے لئے عالی شان تحفے مہیا کئے گئے۔ اور سلطنت کی وہ سڑک جو اورنگ آباد سے بنگالہ کو جاتی ہے خاص طور پر بعجلت تمام درست

کی گئی تاکہ شہزادہ کو سفر میں کوئی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ جگہ جگہ پانی اور غلہ کے ذخیرے قائم کئے گئے۔ جوں جوں شہزادہ حیدر آباد کے قریب پہنچتا گیا ان انتظامات کی دھوم دھام میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور جب حسین ساگر پر اس کی سواری پہنچی تو مغرب کا وقت تھا تمام شہر میں جشن چراغاں منایا گیا تھا۔ چراغوں اور آتش بازی کی کثرت کی وجہ سے حیدر آباد بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ سلطان عبداللہ بڑے طمطراق کے ساتھ شہزادہ کے استقبال کے لئے جلوخانۂ عالی سے نکلے۔ نوبت اور نقاروں کی آواز آسمان تک گونج رہی تھی لیکن فلک کج رفتار موقع تاک رہا تھا اور بدکیش میر جملہ بھولے حیدر آبادیوں کی سادہ لوحی پر ہنس رہا تھا۔

سلطان عبداللہ کا جلوس شہزادہ کے استقبال کے لئے ابھی بادشاہی عاشور خانہ تک نہ پہنچنے پایا تھا کہ خود میر جملہ کے ایک حبشی غلام نے جو مخبری اور جاسوسی کے لئے سلطان عبداللہ کے پاس متعین تھا لیکن بچپن میں بادشاہ کی خدمت کر چکا تھا اس کے احسانات اور نیک دلی کے بدلہ میں اس کے گھوڑے کے قریب بڑھ کر بہ چشم پرنم عرض کیا کہ

"حضور پلٹیے۔ اس سے زیادہ دیکھا نہیں جا سکتا۔ آپ کی جان خطرہ میں ہے۔ میر جملہ چاہتا ہے کہ آپ کو حسین ساگر کے کٹہ پر گرفتار کر کے قتل کر ڈالے۔ یہ صرف محمد سلطان ہی نہیں اورنگ زیب بھی ساتھ ہے۔"

بادشاہ حیران رہ گئے۔ انھیں یقین نہ آسکتا تھا۔ بوڑھا حبشی گھوڑے کے پیروں میں گر گیا۔ اسی وقت کسی نے اس کے خنجر بھونک دیا تھا۔ بادشاہ مجبوراً محل کو واپس ہوئے۔ شہزادہ کو جب یہ خبر پہنچی تو فوراً حملہ کا حکم دیا کیونکہ اندیشہ تھا کہ کہیں باشندگان حیدر آباد کو جنگ کی تیاری کا موقع نہ ہاتھ آئے۔

جشن چراغاں مرگ انبوہ سے بدل گیا۔ مغل سپاہی ہر گلی کوچہ میں قتل و غارت گری میں مشغول ہو گئے۔ شاہی محلات پر قبضہ کر لیا۔ بادشاہ کی تلاش ہوئی۔ وہ پہلے ہی اُس خفیہ راستہ سے جو دادمحل سے گولکنڈہ کے بالاحصار تک شہر اور ندی کے نیچے نیچے سرنگ کھود کر بنایا گیا تھا قلعہ میں پہنچ گئے۔ اس بھنیارے کے نشان اب تک چوک کی مسجد کے قریب جہاں دادمحل واقع تھا موجود ہیں۔ یہ اتنا وسیع تھا کہ وقت واحد میں دو سوار مل کر ہاتھ میں برچھے لئے ہوئے قلعہ تک جا سکتے تھے۔ مغل سپاہیوں نے غریب شہریوں کو جس بے دردی اور درندگی سے لوٹا اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ خاص کر ایسے موقع پر جب کہ وہ ان ہی مغلوں کی ضیافت کے لئے جشن منا رہے تھے۔ مگر میر جملہ کی خوشی کے مقابلہ میں ان غریبوں کی خوشی کی کیا ہستی وہ تو ہیروں کو ہضم کرنا چاہتا تھا۔

رات تمام چراغوں اور آتشبازی کی روشنی میں شہر حیدرآباد جلتا اور لٹتا رہا۔ اور صبح کو اتنا مال غنیمت جمع ہو گیا کہ اس کی قیمت کا اندازہ لگانے سے ہر مورخ قاصر رہا۔ شاہی محلات میں سونے کی چادروں کا فرش تھا۔ وہ سب لوٹ لیا گیا۔ دولت خانۂ عالی کا خالص سونے اور ہاتھی دانت کا بنا ہوا عظیم الشان دروازہ غارت گیا۔ بڑے بڑے قالین جب محلوں سے اٹھائے نہ جا سکے تو ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بانٹ لیا گیا۔ ہفت منزلہ شاہی کتب خانہ کی بیش قیمت مطلا و مذہب کتابیں، سلاح خانہ کے عجوبۂ روزگار ہتھیار، جواہر خانہ کے نادرالوجود جواہرات، اور شاہی کارخانوں اور کوٹھوں کے کم یاب پارچہ جات، قدیم چینی، نقروی اور طلائی برتنوں کے انبار غرض یہ سب کے سب لٹ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب شہر میں صدیوں تک افلاس کا دور دورہ رہے گا۔ لیکن آفریں ہے قطب شاہیوں پر کہ مغلوں کے ہٹنے کے

بعد ہی پھر اپنے شہر کو رشک ارم بنا دیا اور یہ محسوس بھی نہ ہونے دیا کہ شہر پر کوئی بلا نازل ہوی تھی۔

اس وقت تو میر جملہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں ہیروں کو بچا لینے میں کامیاب ہو گیا اور ہیرے دینے کی جگہ اپنے آقا کو ایسی زک دی ہے کہ وہ اب ہیرے مجھ سے طلب کرنے کے قابل بھی نہیں رہے۔ لیکن زمانہ بڑا ستم ظریف ہے۔ وہ ہر فرعون کیلئے ایک موسیٰ پیدا کر دیتا ہے۔ اگرچہ اورنگ زیب کی تخت نشینی تک میر جملہ کی بڑی قدر و منزلت رہی۔ شاہجہاں نے اس کو معظم خاں کا خطاب دیا اور وہ وزیر اعظم بھی بنایا گیا۔ لیکن اس اثنا میں اس کو اپنے وہ تمام عزیز از جان ہیرے سلطان محمد، اورنگ زیب اور خود شاہجہاں کو نذر کرنے پڑے جن کی خاطر وہ حیدر آباد کی تباہی کو ہیچ سمجھتا تھا۔ اسی ہڑبونگ میں اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور اس کے اکلوتے بیٹے محمد امین سے زیادہ عزیز اور انمول ہیرا اس کے ہات سے نکل گیا جو آج کوہ نور کے نام سے چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔

باوجود اس تمام مکروفریب کے میر جملہ کو مغل دربار میں وہ اعزاز اور اعتماد حاصل نہ ہو سکا جس کا وہ متمنی تھا اور جیسا اس کو گولکنڈہ میں حاصل تھا۔ اورنگ زیب اس کو ہمیشہ شک کی نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ اپنے ہر محسن اور ہر دوست کے ساتھ میر جملہ کا برتاؤ از پے کیں نہیں تھا بلکہ اس کا مقتضائے طبیعت ہی یہ تھا۔ اورنگ زیب نے اس کے اہل و عیال اور اس کے فرزند محمد امین کو ہمیشہ اپنے دربار میں بطور یرغمال کے رکھا۔ اور آخری وقت جب وہ بنگالہ میں مغل صوبہ دار کی حیثیت سے مقیم تھا اس کی یہ خواہش تھی کہ میں خود تو ناکام رہا کم از کم اپنے بیٹے کے لئے بنگالہ کی سلطنت چھوڑ جاؤں۔ اس نے بارہا کوشش کی کہ محمد امین شہنشاہ اورنگ زیب کی

قید سے بھاگ نکلے مگر اورنگ زیب کا پنجہ اتنا کمزور نہ تھا جو یہ اس سے نکل سکتا۔ مرض الموت میں وہ بار بار محمد امین کو پکارتا تھا۔ ہیروں کے تھیلے اس کے لئے بار گراں تھے جن کو تمام عمر اس نے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا تھا۔ اور سمجھتا تھا کہ کسی نہ کسی روز میرا بیٹا اورنگ زیب کے قبضہ سے نکلے گا اور اس دولت کی مدد سے اپنی بادشاہت کو مستحکم کر سکے گا۔ اس حالت میں بھی جبکہ وہ اورنگ زیب اور شاہجہاں کو بہت کچھ نذر کر چکا تھا۔ بیس آدمیوں کے وزن کے برابر گولکنڈہ سے لائے ہوئے ہیرے اسکے پاس موجود تھے۔ اس کی زندگی کی آخری گھڑیوں میں نوعمر اور نیک دل سلطان عبداللہ میرزا کے ساتھ اس کی مشہور آفاق بے ایمانی عزرائیل کی شکل میں اسکی روح سلب کرنے کے لئے اس کو ڈرا رہی تھی۔

شعلۂ انتقام

۱۰۸۴ھ

"میری شادی کا بھی عجیب واقعہ ہے!" سید احمد نے مجھے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا تمھارا سیاحت نامہ پڑھنے والے سب سے زیادہ اسی واقعہ پر حیرت کریں گے۔ ولندیسی (ڈچ) لوگ اِس قسم کی باتوں کو دلچسپی سے پڑھتے اور سنتے ہیں۔ آج سے کئی سال قبل تمھارے ملک کے بڑے پادری نے بھی میری شادی کا قصہ بڑے شوق سے سنا تھا۔ اِس شادی نے گولکنڈہ کی سیاست میں انقلاب پیدا کر دیا اور کیا تعجب ہے کہ اگر کسی زمانہ میں تاریخ لکھنے والے میری شادی ہی کو اس سلطنت کے زوال کا سب سے بڑا اور پہلا سبب قرار دیں۔

میں ابھی کم عمر تھا۔ اپنے والد محترم کے ساتھ حرم نبوی میں پنج وقتہ نماز کے لئے جایا کرتا تھا۔ ایک روز نماز ظہر کی سنتیں پڑھ رہا تھا کہ کسی اجنبی شخص نے میرے والد سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"صاحب! یہ غالباً آپ کا لڑکا ہے۔ آپ کی شادی کی طرح اس ہونہار لڑکے کا عقد بھی کسی شہزادی سے ہوگا جس کے لئے اس کو سمندر کا سفر کرنا پڑے گا۔"

میرے والد نے پوچھا:۔ آپ کو یہ کیونکر معلوم ہوا کہ میری شادی شاہی خاندان میں ہوئی ہے؟ مدینہ منورہ میں یہ راز کسی کو نہیں معلوم۔

میں نے تو آج تک کسی سے نہیں کہا!"

"کیا سب باتیں کہنے سننے ہی سے معلوم ہوتی ہیں؟" اجنبی نے جواب دیا "آپ کا بشرہ اور تلوے کی لکیریں اس واقعہ کی سب سے بڑی اور مستند مخبر ہیں۔ یہی حال صاحبزادہ کے پاؤں کا بھی ہے۔ لیکن اس کے نصیب میں بعض چیزیں زیادہ ہیں۔ وہ آپ سے زیادہ اقبال مند ہوگا۔ وہ کئی دفعہ بحری سفر کریگا اور کیا عجب کہ کسی سلطنت کا بادشاہ بھی ہو جائے۔"

میرے والد حیران تھے۔ اس اثنا میں میری نماز ختم ہو چکی تھی اور میں نماز کیا پڑھ رہا تھا۔ گھانس کاٹ رہا تھا۔ میرا دل، میرے کان اور میری ساری توجہ اُسی گفتگو کی طرف منعطف ہو گئی تھی۔ میں اس اجنبی کے قریب پہنچا اور پوچھا .

"آپ شامی ہیں؟"

اُس نے کہا "نہیں، مصری"

میں نے کہا "مجھے بھی وہ علم سکھا دیجئے جس کے ذریعہ سے آپ ایسی غیب کی باتیں معلوم کر سکتے ہیں"

اُس نے کہا "اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میرا قیام بھی اس شہر میں ایک قلیل عرصہ کے لئے ہے۔"

میں نے لجاجت سے کہا "میں رات دن آپ ہی کی خدمت میں حاضر رہوں گا، سخت سے سخت محنت اٹھانے تیار ہوں، آپ اپنے قیام کے زمانہ میں جتنا سکھا سکیں سکھا دیجئے۔"

میرے والد پہلے تو انجان رہے لیکن جب میرا اشتیاق دیکھا تو انھوں نے بھی اس اجنبی سے میری سفارش کی اور کہا کہ "یہ لڑکا بڑا تیز اور ذہین ہے۔ اگر آپ

توجہ فرمائیں تو بہت جلد سیکھ لے گا۔"

اجنبی نے رضامندی ظاہر کی اور میں اُسی وقت سے اُن کے سر ہو گیا، اور سایہ کی طرح ساتھ رہنے لگا۔ ریاضی، ہئیت، فراست الید، رمل غرض جو کچھ وہ جانتے تھے اس کو حاصل کرنے کا مجھے شوق ہو گیا۔ اور اب میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ان سب علوم میں مجھے دسترس حاصل ہو گئی، البتہ اتنا ضرور ہے کہ ناواقف بھی نہیں ہوں! اور چونکہ میرا دماغ ریاضی کی طرف زیادہ مائل تھا میں نے اس طرف زیادہ توجہ کی اور یہی وجہ ہے کہ فرنگی لوگ میری ریاضی دانی کی ہمیشہ تعریف کرتے رہے ہیں۔ میرے استاد نے میرے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر اُسی وقت کہدیا تھا کہ ذرا سی کمی رہ گئی ہے مگر یہ بھی انشاء اللہ امتداد زمانہ کے ساتھ ختم ہو جائے گی اور تم ایک نہ ایک روز بادشاہ بنو گے۔ افسوس ہے کہ آخر وہ کمی رہ ہی گئی اور اب تک امتداد زمانہ کا اُس پر کوئی اثر نہیں پڑا ورنہ آج ابوالحسن کی جگہ میں بادشاہ ہوتا اور وہ میری جگہ اس محل میں قید ہوتا۔ خیر، یہ تو وہ امور ہیں جن کا تذکرہ اس وقت غیر ضروری ہے۔ میں جب کبھی اپنی عمر رفتہ پر غور کرتا ہوں تو سر بگریباں رہ جاتا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر انسان کس بات پر بھروسہ کرے۔ وہ ایک وقت کسی چیز کو خوش آئند سمجھتا ہے لیکن دوسرے وقت وہی چیز حسرت سے بدل جاتی ہے۔ میری زندگی نے جیسے نشیب و فراز دیکھے ہیں شاید ہی ابوالحسن کو اُن سے سابقہ پڑا ہو۔ وہ میرے مقابلہ میں زندگی کے حسن و قبح اور نور و ظلمت کے تجربوں کے لحاظ سے ابھی بچہ ہے۔ آج دار السلطنت کے شعراء اور خوشامدی امراء اس کو زمانہ دیدہ اور تجربہ کار ثابت کرنا چاہیں تو کیا وہ حقیقت اور واقعیت پر پردہ ڈال سکتے ہیں؟ کیا صداقت کبھی بے نقاب

نہ ہوگی؟ کیا طبعی اور غلام علی کے قصیدے الہام ہیں جو اُن میں لکھے ہوئے واقعات کا بطلان ناممکن ہو۔ کیا تم نے بھی ان شاعروں کی جھوٹی تعریفیں کبھی پڑھی ہیں؟"

سلسلۂ کلام منقطع کرتے ہوئے مظلوم سید احمد نے مجھ سے پوچھا۔ لیکن اس کو اپنی ہی تقریر میں اتنا لطف آرہا تھا کہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ پھر کہنے لگا:۔

"طبعی نے ابوالحسن کے مرشد شاہ راجو کا مرتبہ اولیا کیا انبیا سے بڑھا دیا ہے۔ اور کس قدر جھوٹ کہتا ہے کہ شاہ راجو ہی کی کرامت تھی جو ابوالحسن، بادشاہ کا داماد بنا اور پھر بادشاہ ہوا۔ حالانکہ اگر میں مخالفت نہ کرتا اور اپنے ساتھ ملکہ کو ہم خیال نہ کر لیتا تو کس کی مجال تھی کہ سید سلطان کی شادی کو روک سکتا؟ کیا اُس وقت دنیا میں کوئی ایسی قوت تھی جو قطب شاہی شہزادی کو اس بدتمیز کے قبضہ سے چھڑا سکتی۔ یہ صرف میرے قدموں کا طفیل ہے کہ اس فقیر کو شہزادی ملی"۔

میں نے دیکھا سید احمد جذبات کے جوش میں آپے سے باہر ہوا جا رہا ہے اور اگر میں اس وقت اس کو نہ روکوں تو نہ معلوم بادشاہِ وقت کی شان میں اس کی زبان سے کیا کیا نکل جائے۔ اس کے پاس اب ابوالحسن کے خلاف استعمال کرنے کیلئے شکوہ و شکایت اور زبانی جمع و خرچ کے سوا کوئی اور حربہ باقی نہ تھا۔ جب انسان اس طرح مجبور ہو جاتا ہے تو چرب زبانی یا دشنام دہی پر اتر آتا ہے۔ بادشاہی جاسوس ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اور خاصکر ایک ایسے محل میں جہاں سلطنت کا ایک دعویدار نظر بند کر دیا گیا ہو جتنی بھی احتیاط کی جاتی کم تھی۔ میں اس قدر محتاط تھا کہ در و دیوار سے بھی ڈرتا تھا کیونکہ سید احمد کے قدیم ملازمین اور مصاحبین میں سے صرف میں ہی وہ خوش قسمت تھا جس کو ہفتہ میں دو دفعہ اس بے دست و پا سے ملنے کی اجازت دیگئی تھی

اور میں محسوس کر رہا تھا کہ میری ہر حرکت پر شاہی جاسوسوں کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ بہرحال میں نے اس بھوکے شیر کے جوش کو بہ دقت تمام روکا اور کہا کہ :-

"ہاں پھر آپ کے مصری استاد کا کیا حشر ہوا؟"

حشر! حشر تو ابھی سب کا باقی ہے۔ وہیں میں ان بے ایمانوں موسیٰ خاں، سید مظفر، اور مادنا کو دیکھ لوں گا جنھوں نے میرے خلاف سازش کی، میرا حق مجھ سے چھین لیا اور ابوالحسن کو بادشاہ بنا دیا۔ خیر۔ میرے استاد (خدا کرے ان کو حشر میں بہترین درجہ نصیب ہو) انھوں نے مجھے سکھانے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی اور اپنے نظام اوقات کے خلاف میری خاطر ایک سال اور مدینہ میں ٹھہرے رہے۔ ان کے جانے کے بعد میرے والدین بھی یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے اور میں تن تنہا رہ گیا۔ میری والدہ محترمہ اپنے ساتھ ایران سے بہت کچھ دولت لائی تھیں۔ جب وہ ختم ہونے آئی تو میں سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ سمندر کے سفر کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے! آخر جو کچھ رہا سہا تھا اُسی کو سمیٹ کر تنہا بہ تقدیر چل کھڑا ہوا۔ چونکہ مجھے اپنے علم رمل پر اعتقاد تھا اور اس وجہ سے مجھے اطمینان اور یقین تھا کہ گولکنڈہ کی شہزادی میری قسمت میں ہے، میں جہاز سے مچھلی بندر کے ساحل پر اترا اور سیدھا گولکنڈے کی راہ لی یہاں کا عجب ہی رنگ تھا۔

میں اس شادی کے مراحل کو اپنے خیال میں جس قدر آسان سمجھتا تھا گولکنڈہ آنے پر معلوم ہوا کہ یہ اُسی قدر دشوار ہے۔ پہلے تو اجنبی ہونے کی حیثیت سے شہر میں داخل ہونا ہی آسان نہ تھا اور جب داخل ہوا تو بادشاہ کے دربار میں رسائی پانی اور بھی زیادہ دقت طلب! دن بھر دولت خانۂ عالی کی سنہری چوکھٹ کے روبرو بیٹھا رہتا کوئی نہ پوچھتا کہ یہ کس باغ کی مولی ہے؟ ع کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی۔ امیر تو امیر ہی

ہوتے ہیں کسی غریب نے بھی تو منہ نہ لگایا! اور نہ میری طرف توجہ کی۔ البتہ جہاں شاہی جلو خانہ میں دسترخوان عام پر کھانا چن دیا جاتا تو شاہی خدمت گار قریب آتے اور دسترخوان پر چلنے کے لئے اصرار کرتے۔ مگران کم بختوں نے بھی تو کبھی یہ نہ پوچھا کہ کون ہو اور کس غرض سے آنا ہوا ہے؟

جب کئی دن اسی طرح کس مپرسی میں گذر گئے تو میں نے جامع مسجد کے پیش امام سے ایک دن پوچھا کہ اس ملک میں بادشاہ تک رسائی پانے کا کیا طریقہ ہے؟ اس نے کہا پہلے محمد سعید میر جملہ سے اجازت لینی پڑتی ہے اور جب وہ راضی ہو جائے تو سمجھئے کہ آپ شاہی دربار میں پہنچ گئے۔ مشکل یہ ہے کہ اُس سے ملنا بھی تو آسان کام نہیں مگر تم کئی روز سے پریشان ہو' آئندہ جمعہ کی نماز میں اگر میر جملہ آگئے تو میں تمھاری ضرور سفارش کر دوں گا۔

غرض اُس بوڑھے پیش امام کی مہربانی اور سعی سے میر جملہ کی ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ اپنی عمر میں میرے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ ایک ایسے عالیشان محل کے اندر قدم رکھا تھا۔ جس وسیع دالان میں ہم لوگ میر جملہ کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے مقابل بھرپور تالاب کی مضطرب موجیں عجیب منظر پیش کر رہی تھیں انھیں دیکھ دیکھ کر مجھے سمندر کے سفر کا لطف آرہا تھا۔

میں ہمہ تن اس نظارہ میں محو تھا کہ میر جملہ کے برآمد ہونے کا شور بلند ہوا۔ میں اس قسم کے تکلفات اور آداب کا عادی نہ تھا۔ میری ساری عمر مدینہ منورہ میں گذری البتہ میری والدہ ماجدہ اپنے والد اور بھائی کے درباروں کی کیفیت جب بیان کرتی تھیں تو میں تخیل میں ڈوب جاتا اور نیند میں اِسی طرح کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اب جو عالم بیداری میں میر جملہ کا شاہی دربار دیکھا تو مرحوم والدہ کی گفتگو اور ان کی صورت

میری آنکھوں میں پھر گئی۔ میں ساکت وصامت کھڑا تھا کہ میرے قریب کے ایک امیر نے میرا ہاتھ آہستہ دبا کر کہا "جھک کر آداب بجالاؤ"۔

اتفاق سے میر جملہ کی نظر اُسی وقت ہم پر پڑی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا "تم تو کوئی اجنبی معلوم ہوتے ہو؟ کیونکر آنا ہوا؟ کیا چاہتے ہو؟" میں نے ملایم الفاظ میں بادشاہ سے ملنے کی اجازت چاہی۔ اُس نے کہا "کس غرض سے ملنا چاہتے ہو"؟ میں نے کہا "میں اپنی غرض صرف بادشاہی سے بیان کردوں گا۔"

وہ دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہوگیا اور پھر آخر تک اُس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ جب دربار برخواست ہوا، میں پریشان حال پیش امام کے یہاں دوڑا ہوا گیا۔ یہ قصہ سُن کر وہ برآشفتہ ہوگیا، اس نے کہا "اس ظالم سے اپنی غرض صاف صاف کیوں نہیں کہہ دی! وہ تو آج کل بادشاہ سے زیادہ طاقتور ہے! اس کا غرور خدا ہی توڑے تو توڑے۔ خود بادشاہ بھی تو اس فرعون سے آج کل ڈرنے لگے ہیں۔ اب اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے!"

میں نے بوڑھے سے رائے لی کہ اب کیا کیا جائے؟ اس نے ذرا سوچ کر جواب دیا میں ایک اور نواب سے ملا دوں گا وہ تمھاری سفارش شاید کردے۔ غرض اس غریب نے اس وقت میری بڑی دلجوئی اور مدد کی اور میں اسی کی امداد سے آخرکار شاہی دربار میں پہنچ ہی گیا۔ جب سلطان عبداللہ نے مجھ سے پوچھا، کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں نے صاف صاف کہدیا کہ "آپ کی صاحبزادی سے عقد کرنے کی تمنا میں مدینہ منورہ سے یہاں آیا ہوں اور کئی روز تک دربار میں حاضر ہونے کے لئے پریشان پھرتا رہا کسی نے نہ پوچھا، آج بخت کی یاوری سے ملاقات کی آرزو بر آئی ہے۔"

میری اس صاف گوئی پر بادشاہ اور اہل دربار حیران تھے۔ بادشاہ نے

ایک مصاحب خاص سے کہا "یہ شخص بہکا ہوا معلوم ہوتا ہے، اس کو حراست میں رکھ کر تفتیش کرو کہ کیا معاملہ ہے؟" میں یہی کہتا رہا کہ "آپ مجھے دیوانہ سمجھتے رہیں مگر ایک دن میری شادی شہزادی سے ہوگی...... ضرور ہوگی" ابھی یہ جملے ختم بھی نہ ہوئے تھے کہ چوبداروں نے چاروں طرف سے مجھے گھیر لیا۔ اور ایک تاریک تہہ خانہ میں لے جاکر قید کر دیا۔ وہاں کئی روز تک میں شاہی خدمت گاروں اور سپاہیوں کا کھلونا بنا رہا۔ ہر وہ شخص جو وہاں آتا میرا مضحکہ اڑاتا۔ میں تنگ آگیا تھا اور دل میں اپنے استاد کو گالیاں دیتا تھا کہ اس کی وجہ سے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ کوتوال اور شاہی امراء بھی آئے اور متعدد سوالات کئے میں نے کسی کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

آخر بادشاہ نے تنگ آکر ایک روز مجھے خلوت میں بلا بھیجا۔ وہاں میر جملہ بھی موجود تھا۔ میں نے وہی فقرے دہرائے جو بر سر دربار کہے تھے۔ میر جملہ نے پوچھا "تم کہاں سے آئے ہو اور تمھارا حسب نسب کیا ہے؟" میں نے ہر بات بلا کم و کاست بیان کر دی۔ میر جملہ دل میں تو میری سچائی کا قائل ہوگیا تھا لیکن اس نے بادشاہ سے کہا "یہ شخص واقعی کچھ دیوانہ سا معلوم ہوتا ہے اس کو مدینہ منورہ تک سرکاری بدرقہ کے ساتھ روانہ کر دینا چاہیئے نہ تو یہ دیوانہ یہاں رہنے پائے اور نہ شہر میں بادشاہ اور شہزادی کے متعلق طرح طرح کی جھوٹ سچ خبریں مشہور ہوتی رہیں"۔

میں اسی روز ظہر کے بعد گولکنڈہ کے چند سپاہیوں کے ساتھ مچھلی بندر کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ انھوں نے مجھے ایک پرتگالی جہاز میں سوار کرا دیا۔ اور کپتان سے ضمانت کی چٹھی لکھالی کہ وہ مجھے عربستان ہی میں چھوڑ دے گا۔ جہاز والوں نے مجھ پراگندہ روزگار کے ساتھ بڑا اچھا برتاؤ کیا اور شہزادوں کی طرح خاطر تواضع کی۔ جب میں مدینہ منورہ پہنچا تو سیدھا مسجد نبوی میں دوگانہ شکرانہ ادا کرنے کے لئے داخل ہوا۔ وہاں کیا

دیکھتا ہوں کہ ایک شخص جس کو میں حیدر آباد میں میر جملہ کے دربار میں دیکھ چکا تھا مسجد کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا ہے وہ مجھ کو دیکھ کر تیزی سے چلتا ہوا میرے پاس آیا اور کہا "جناب عالی! میں آپ کی تلاش میں کئی دن سے پریشان ہوں۔ نواب میر جملہ بہادر نے لیجئے یہ خط دیا ہے" اور مجھے بھی تاکید کی ہے کہ آپ کو اپنے ساتھ لے کر فوراً واپس چلا آؤں"۔ میں نے پوچھا "تم مجھ سے اول یہاں کیونکر پہنچ گئے"۔ اس نے جواب دیا جس روز آپ حیدر آباد سے چلے ہیں میں بھی اسی روز نکلا تھا لیکن نواب نے مجھے مچھلی بندر نہیں، سورت کو روانہ کیا، اور کہا تھا کہ دوگنی رفتار سے بندرگاہ تک پہنچنا ورنہ وہ جہاز جس میں ہماری تجارت کا سامان جارہا ہے نکل جائے گا۔"

میں اس شخص کا منہ تک رہا تھا اور وہ اس وقت میرے سامنے ایسا مودب کھڑا تھا جیسے کسی شہزادہ کے حضور میں ملازم کھڑے ہوتے ہیں میں نے اس شخص کو میر جملہ کے سامنے بھی اسی طرح کھڑا ہوا دیکھا تھا۔ جب میں نے اس خط کو جو اس نے مجھے دیا، پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ کیوں میرے سامنے اس طرح مودب کھڑا ہے؟ نیز جہاز والوں نے بھی میرے ساتھ ایسا اچھا برتاؤ کیوں کیا تھا؟

اس خط سے معلوم ہوا کہ میر جملہ نے بادشاہ کو مجھ سے قصداً بدظن کرادیا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو شہزادی کی شادی مجھ سے ہو جاتی۔ گر وہ بادشاہ کا بہی خواہ نہ تھا! اس نے خود غرضی کی بناء پر ایک تو بادشاہ کو دھوکہ دیا اور دوسرے مجھے محروم لوٹا دیا۔ اس کی غرض یہ تھی کہ میں اس کا داماد بنوں۔ اس منصوبہ کے بغیر وہ اپنی لڑکی سے میری شادی کس طرح کر سکتا تھا۔ اس کو مجھ جیسا اعلیٰ حسب نسب داماد نہیں مل سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں شاہ عباس صفوی کا حقیقی ہمشیر زادہ ہوں اور میرے والد استاد البشر سید معصوم شیراز کے مشہور و معروف سید اور صاحب دل

صوفی منش بزرگ تھے۔

میں پریشان تھا۔ سفر کے تلخ تجربوں نے مجھے قنوطی بنادیا تھا۔ اب میں دنیا کے نشیب و فراز سمجھنے کے قابل ہوچکا تھا۔ میر جملہ کے پیام بر نے مجھے بڑے بڑے لالچ دلائے۔ زر و جواہر اور قیمتی تحائف پیش کئے جو میر جملہ نے اپنے حصول مقصد کے لئے روانہ کئے تھے۔ انسان گذرے ہوئے صدموں اور تکلیفوں کو بہت جلد بھول جاتا ہے۔ یہ فطرت کا بڑا احسان ہے اگر ایسا نہ ہوتو دنیا دنیا نہ رہے شہر خموشاں بنجائے۔ میں نے بھی عسرت کی زندگی پر فراغ بالی کو ترجیح دی۔ عربستان کے گرد آلود چٹیل میدان اور خشک فضا سے جی بھی اکتا گیا تھا میر جملہ کا عالیشان محل اور وہاں کے سرسبز و شاداب باغات اور ان کے کنارے لبالب تالاب کی موجوں کا لب ساحل پر اٹکھیلیاں کرتے ہوئے گذرنا' یہ تمام مناظر میری آنکھوں میں پھر رہے تھے خصوص بھاگ نگر کی پریمی وادیوں نے میرے دل کو چھین ہی لیا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر میں سپاہیوں کی نگرانی میں جہاز پر سوار نہ ہوتا تو راستہ ہی سے حیدر آباد چلا آتا۔ حاصلِ کلام' مدینہ منورہ سے نکلنا پڑا۔ اب کے سفر بڑا خوشگوار تھا۔ اور میرا اس طرح حیدر آباد پہنچنا بھی ایک روحانی کیفیت سے خالی نہ تھا۔ گلی گلی کوچہ کوچہ میری آمد کی شہرت تھی۔ میر جملہ نے مشہور کر دیا تھا کہ شریف مکہ کا بیٹا آرہا ہے۔ بڑے بڑے امرا میرے استقبال کے لئے آئے اور بڑے بڑے عالموں اور فاضلوں نے میری تعظیم کی۔ میں زمانہ کے اتار چڑھاؤ پر حیرت کر رہا تھا۔ یہ وہی شہر ہے' وہی گلی کوچے ہیں' وہی آب و ہوا ہے' اور وہی لوگ ہیں مگر اب میں وہ نہیں رہا تھا۔ پہلے میں ایک غریب آدمی تھا اس لئے کسی نے توجہ نہ کی اور نہ حال پوچھنا ہی گوارا کیا۔ اب میں جھوٹ موٹ شریف مکہ کا بیٹا ہوں

اور سچ مچ میر جملہ کا نامزد داماد! اب یہ عالم ہے کہ بڑے سے بڑا امیر بھی مجھے ایک دفعہ دیکھ لینا باعث برکت سمجھتا ہے۔ میر جملہ کے تالاب کی سڑک کئی روز تک میرے دیدار کے مشتاقوں سے کھچا کھچ بھری رہی۔ جب میں باہر نکلتا تو میرے ہاتھی کے اطراف ہزاروں آدمی میرے درشن کے لئے راستوں پر جمع ہو جاتے۔ چونکہ میر جملہ کا بیٹا محمد امین بڑا عیاش بدچلن اور بدنام تھا اس لئے میر جملہ کے سارے متوسلین اور حاشیہ نشین میرے طرف دار ہو گئے اور میرے اشاروں پر چلنے لگے۔

یہ سب کچھ تھا مگر مجھے اپنے استاد کی پیشین گوئی رہ رہ کر یاد آتی تھی اور یہ کانٹا کسی طرح دل سے نکلتا ہی نہ تھا میں غور کرتا رہتا کہ کیا واقعی میر جملہ ہی کی لڑکی میری قسمت میں ہے؟ کیا بادشاہ سے مراد نواب میر جملہ ہی تو نہیں ہیں؟ میر جملہ سے طبعاً مجھے نفرت تھی! ایک میں کیا، تمام حیدر آباد اس کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ وہ اور اس کا بیٹا دونوں سارے ملک میں بدنام تھے۔ قطع نظر اس کے قطب شاہی شہزادی کے مقابلہ میں میر جملہ کی صاحبزادی کی کیا ہستی؟ یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ محمد امین بھی شہزادی پر بوالہوسانہ عاشق تھا۔ وہ میرے سامنے بھی اکثر گھنٹوں اسکے حسن و جمال کی تعریف سے اپنے ہونٹ خشک کرتا۔ اس نے شاہی مصوروں کے ذریعہ سے اس کی کئی وضع کی تصویریں اپنے یہاں جمع کر رکھی تھیں اُن کو دیکھ کر میں بھی شہزادی کے حسن و جمال کا دیوانہ ہو گیا۔ پرانا جنون پھر عود کر آیا۔ اور میں دل ہی دل میں کڑھنے لگا۔ اس سراپا مکر و فریب دنیا میں سچا ہم راز کہاں مل سکتا ہے! بجز محمد امین کے اور کوئی مجھ سے میرے دفار کے باعث دل کھول کر گفتگو تک بھی تو نہیں کر سکتا تھا؟ اب مجھے بار بار بوڑھے پیش امام کی یاد ستانے لگی۔ موجودہ کر و فر کی وجہ سے اس غریب کی رسائی مجھ تک نہیں ہو سکتی تھی اور نہ میں اسکے یہاں

جا سکتا تھا۔ وہ جانتا بھی نہ تھا کہ شریف مکہ کا بیٹا وہی غریب پردیسی شخص ہے جس کی سفارش میں نے میر جملہ سے کی تھی، اور اس کے بُرے وقت کام آیا تھا۔ میں بغیر جلوس کے باہر نکل بھی تو نہیں سکتا تھا۔ مجھے حیدر آباد کے گذشتہ زمانۂ سیاحت پر رشک آنے لگا جب کہ میں کس آزادی کے ساتھ جہاں چاہتا چلا جاتا تھا!! اس وقت میری طرف کوئی دیکھتا تک نہ تھا۔ سچ ہے آزادی اور بے فکری انسان کے لئے بڑی نعمت ہے! میں سوچتا، کہ کل میں صحیح معنوں میں جنت میں تھا اور آج واقعی دوزخ میں ہوں۔ اور یہ شعر میرے لئے الہامی تھا کہ

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را با کسے کارے نباشد

میں نے آخر تنگ آکر اپنے ہونے والے سالے محمد امین سے ایک دن کہا:۔

"بھلے آدمی یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ جہاں چاہیں جا نہیں سکتے، اور جائیں تو سیکڑوں آدمی ساتھ ہوں جیسے قیدی جا رہا ہو۔ ایسی امیری سے تو فقیری بہتر۔ ہم اپنے ملک میں بھی امیر تھے لیکن ایسے امیر نہیں کہ غلاموں سے بڑھ کر مجبور اور پابند۔"

محمد امین سرور کے عالم میں تھا اس نے جواب دیا:۔

"تم کہاں جانا چاہتے، میرے ساتھ شام میں چلو، تم کو نہیں معلوم میں روز تنہا اپنی محبوبہ ماہ کنور کے یہاں اکیلا چھپ کر چلا جاتا ہوں اور نواب کو خبر تک نہیں ہوتی۔ مگر دوست تم کو ساتھ لیجانا مشکل ہے؟ کیونکہ تمھاری نقل و حرکت کے متعلق نواب نے جاسوس بھی مقرر کر رکھے ہیں۔" یہ سُنکر مجھے یقین ہو گیا کہ میر جملہ نے جو مجھے اس طرح قید کر دیا ہے اس کا مطلب سوا اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ شہزادی سے میری شادی اب بھی ہو سکتی ہے۔

بہر حال میں اسی رات محمد امین کے ساتھ چور دروازہ سے نکلا اور اپنے پرانے دوست جامع مسجد کے پیش امام کے یہاں پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے اسے اپنا سب احوال کہہ سنایا اور مدد طلب کی۔ بوڑھا پیش امام میرا قصہ تو سن رہا تھا مگر میر جملہ کے ڈر سے کانپ رہا تھا۔ میری لجاجت پر اس نے یوں زبان کھولی:
"اگر نواب کو معلوم ہو جائے ...... معلوم ہونا یقینی ہے .... تو پھر ہماری خیر نہیں"۔ میں نے اس کے شانے پر ہات مار کر کہا "اگر شہزادی سے میری شادی ہو جائے تو پھر نواب کا غیظ و غضب تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہے" بوڑھے نے ہنستے ہوئے جواب دیا:
"تمھاری شادی تک میر جملہ مجھے تھوڑا ہی زندہ رہنے دیگا؟ خیر مجھے تمھاری خاطر سے زیادہ بادشاہ کی خیر خواہی منظور ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ بادشاہ دھوکہ میں رہے"۔

غرض اس نے چند روز میں ایسی ترکیب کی کہ بادشاہ نے میر جملہ کو بلا کر کہا:۔

"افسوس کا مقام ہے کہ شہزادی کی شادی تو نہ ہوا اور تم اپنی لڑکی کی شادی کر دیں بہتر یہ ہے کہ شریف مکہ کے لڑکے سید احمد سے اسی مہینہ میں شہزادی کی شادی ہو جائے"۔

میر جملہ سخت ناراض تھا۔ اور عجب نہیں وہ کسی ترکیب سے اس معاملہ کو ٹال دیتا مگر ملکہ اس کی چال بازیوں کو خوب سمجھتی تھیں۔ انھوں نے اسی وقت شاہی ہاتھی اور امراء کو بھیج کر مجھے طلب کیا اور اپنے ایک شاہی محل میں رہنے کا حکم دیا۔ میرا عجب حال تھا۔ آج ایک کے قبضہ میں ہوں تو کل ایک کے! میں شاہی محل میں آگیا، بارگاہِ ایزدی میں سجدۂ شکر بجا لایا۔ اور دوسرے روز بوڑھے پیش امام کو بلا بھیجا تاکہ اس کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کروں۔ لیکن یہ معلوم کر کے بڑا رنج ہوا کہ کل رات ہی میں اس کا اچانک

انتقال ہوگیا ہے میں سمجھ گیا کہ یہ میر جملہ کا شعلۂ انتقام ہے جس نے سب سے پہلے اس غریب کی کشتِ حیات کو جلادیا۔

عقد کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی بڑی رات گئے شب گشت کا جلوس نکلا اور قطب شاہی دستور کے مطابق جامع مسجد میں علی الصباح بہ حیثیت نوشہ دوگانۂ شکر پڑھنے کے لئے داخل ہوا تو ملک و مالک کے اس بوڑھے جاں نثار پیش امام کی یاد میں میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلنے لگے۔ حیدرآباد میں وہی ایک شخص تھا جو میری خوشی میں خوش اور غم میں رنجیدہ ہو سکتا تھا۔ والدین اور مصری استاد کے بعد میں اس کا نام اور اس کے خدمات ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

سروِ صحرا

پیماملی پیٹھ آج ایک چھوٹا سا قصبہ رہ گیا ہے جس کی عالیشان قطب شاہی مسجد کے خوبصورت مینار حیدرآباد سے حمایت ساگر جانے والی سڑک کی بائیں طرف اب بھی راستہ سے گزرنے والوں کو اپنے طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ مقام گولکنڈہ کے زندہ دل بادشاہوں کی بہترین تفریح گاہ سمجھا جاتا تھا۔ اس سلطنت کے بادشاہوں اور امیروں نے قلعہ کے باہر دور دور تک اس قسم کے شبستان آباد کر رکھے تھے، اور جب کبھی درباری زندگی اور سیاسی الجھنوں سے فرصت ملتی تو قلعہ سے نکل کر ہر ایک اپنے گوشۂ عشرت میں دل بہلاتا تھا۔ ان شبستانوں کے آباد کرتے وقت دو باتوں کا ضرور خیال رکھا جاتا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہاں سے اُن کی اُمیدوں کا آماجگاہ قلعہ گولکنڈہ نظر آتا رہے، اور دوسری یہ کہ وہاں سب سے پہلے ایک شایانِ شان مسجد کی بنا ڈالی جائے۔ چنانچہ گولکنڈہ کے اطراف واکناف میلوں تک جنگلوں میں جو خوشنما مسجدیں نظر آتی ہیں وہ قطب شاہیوں کے انہی عشرت کدوں کے باقی ماندہ آثار ہیں۔ اِن کے قرب و جوار کے پُرتکلف محلات اور بارونق بازار تو صدیوں کی ویرانیوں اور سیاسی افراتفریوں کی وجہ سے نیست و نابود ہو گئے لیکن مسجدیں باقی رہ گئیں۔ رہے نام اللہ کا۔

۲

پیما متی پیٹھ میں اب تک مشہور ہے کہ تاناشاہ بادشاہ ہر جمعرات کو قلعہ سے یہاں آجاتا تھا اور ایک رات گذار کر دوسرے دن جمعہ کی نماز اس مسجد میں پڑھنے کے بعد شکار کھیلتے ہوئے قلعہ کو واپس ہو جاتا۔ بادشاہ کو ملکہ کا بڑا خیال تھا۔ وہ حد درجہ نازک مزاج تھی۔ جب کبھی جلال میں آجاتی تو پھر کسی سے نہ سنبھلتی اور قطب شاہی محل اس کی گرج دار آواز سے لرزنے لگتے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ تنک مزاج اور خبطی ہو گئی تھی۔ مغلوں کے مخالفانہ پروپگنڈے نے تاناشاہ بادشاہ کو فاسق و فاجر مشہور کر رکھا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ دوسرے بادشاہوں کی طرح اس کے محل میں حرم کا وجود ہی نہ تھا۔ البتہ ایک ایسا واقعہ پیش آگیا تھا کہ بادشاہ ایک غریب کسان کی بیکس لڑکی کو اپنے محل میں پناہ دینے پر مجبور ہو گیا تھا جس کا ایک قصہ ابتک پیما متی پیٹھ اور اس کے نواح میں زبان زد خاص و عام ہے۔ اور وہ یہ ہے۔

تخت نشینی کے چند ماہ بعد ہی بادشاہ شکار کے لئے نکلا تھا۔ ہرن کے تعاقب میں وہ اپنے ساتھیوں سے دور نکل چکا تھا کہ پیما متی پیٹھ کے قریب اس کو ایک کسان کی جھونپڑی میں سے کسی کے آہستہ آہستہ رونے کی آواز سنائی دی۔ قریب پہنچکر اس نے دیکھا کہ ایک خوبصورت لڑکی ایک بوڑھے کا سر اپنے زانو پر لئے بیٹھی ہے، اور زار و قطار رو رہی ہے۔

بادشاہ پر بھی ایک زمانہ ایسا گذر چکا تھا جب وہ خود جنگل میں جھونپڑی میں رہا کرتا تھا اس پر اس حالت کا بڑا اثر ہوا۔ وہ فوراً گھوڑے پر سے اتر پڑا اور قریب ہو کر دریافت کیا۔ غریب دہقان زادی بادشاہ کو اپنی جھونپڑی میں دیکھ کر

دنگ ہوگئی۔ اس کے آنسو تھم گئے۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے پہلے بھی بادشاہ کی سواری اپنے باپ کے کھیت کے قریب سے گذرتی ہوئی دیکھی تھی اور اس کے باپ نے کہا تھا کہ "بادشاہ کی صورت کا نظر آجانا ہی برکت اور خوشحالی کا باعث ہے" اس خیال سے وہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنتے ہی ان کی طرف دوڑتی تھی تاکہ بادشاہ کا چہرہ نظر آجائے لیکن اس کو کبھی ایسا موقع نہ ملا تھا کہ اچھی طرح دیکھ سکتی۔

آج جو اس نے اس قدر قریب سے بادشاہ کو دیکھا تو اُس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اور نہ معلوم کب تک یہ حالت جاری رہتی اگر بادشاہ بکمال شفقت اس کے رونے کا سبب دریافت نہ کرتا۔ جب لڑکی کے ہوش وحواس درست ہوئے تو اس نے سنبھل کر اپنے نیم برہنہ جسم کو اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں سے ڈھانپتے ہوئے عرض کیا:۔

"میرا باپ ہمیشہ کہتا تھا کہ بادشاہ کی صورت نظر آجائے تو خوشی ہی خوشی ہے۔ حالانکہ آج تو میرے سر پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے یا تو آپ بادشاہ نہیں ہیں اور اگر میں واقعی بادشاہ سلامت کو دیکھ رہی ہوں تو پھر میرے بوڑھے باپ کو سانپ نے کیوں ڈسا اور اس نے اس قدر جلد کیوں آنکھیں بند کرلیں۔"

بادشاہ ابھی اس سے محو کلام ہی تھا کہ خدام شاہی پہنچ گئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ فوراً کسی طبیب یا سانپ کا عمل جاننے والے کو بلایا جائے۔ اس نے دہقان دوشیزہ کو تسلی دی اور اپنے چند ملازمین وہاں چھوڑے۔ چلتے ہوئے اُس نے لڑکی سے کہا:۔

"بادشاہ کی صورت نظر آجانے کے بارے میں تمھارا باپ جو کچھ کہتا تھا اُس کے آزمانے کا دراصل یہی وقت ہے۔"

۳

دوسرے روز صبح میں بادشاہ کو اطلاع ملی کے کسان جانبر نہ ہو سکا۔ سانپ ڈسے ہوئے عرصہ گذر چکا تھا۔ طبیبوں اور عاملوں نے رات تمام اس کی لاش کے ساتھ بیکار محنت کی بادشاہ نے حکم دیا کہ بدقسمت دہقان کی حرماں نصیب لڑکی کو سایۂ عاطفت میں لے لیا جائے۔

شام ہونے سے قبل دہقان زادی قلعہ گولکنڈہ میں پہنچا دی گئی جہاں اس کو محل کی اصیلوں اور خادماؤں نے حمام کرا کے خلعت فاخرہ میں ملبوس کیا اور دولتخانۂ عالی کے اُس قطعہ میں فروکش کیا جو کسی زمانے میں بیما متیٔ اور تارا متی کی قیام گاہ رہ چکا تھا۔ تاناشاہ نے تاکید کر دی تھی کہ اس کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کیا جائے تاکہ وہ بہت جلد اپنے باپ کا غم بھول جائے۔

چند روز گذرنے کے بعد بادشاہ کو معلوم ہوا کہ غریب دہقان زادی اب بھی غم زدہ ہے اور اس کا اکثر وقت رونے میں گذرتا ہے۔ تاناشاہ اس کی آزادانہ گفتگو اور بے باک حسن ملیح سے متاثر ہو چکا تھا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ محل کی آسائش اور شاہانہ لباس اور زیور پہن کر وہ اپنی قدیم زندگی کو بالکل بھول جائے گی لیکن شاید اس کو یاد نہ رہا کہ خود گولکنڈہ جیسی سلطنت کا بادشاہ ہو جانے اور خداداد محل اور گگن محل جیسے فلک بوس محلات میں اقامت گزیں ہونے کے باوجود بعض اوقات تنہائی میں اپنے بچپن کے جھونپڑے اور دیہات کی آزاد زندگی کو یاد کر کے بے چین ہو جاتا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ اِس سرو صحرا کو اس کے حضور میں لایا جائے۔

دہقان زادی نے جب کئی روز کے بعد بادشاہ کی صورت دیکھی تو اس کو پھر سے اس گھڑی کا خیال آگیا جب کہ وہ اپنی جھونپڑی میں اپنے باپ کی لاش لئے بیٹھی تھی۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔ خادموں نے سمجھایا کہ تم اس وقت ظل اللہ کے حضور میں ہو اور یہ طریقہ آداب کے خلاف ہے بادشاہ نے خود بھی دلاسا دیا اور کہا:-

"تم اس قدر رنجیدہ کیوں ہو؟ تمھیں تو خوش ہونا چاہیے!"

دوشیزہ نے جواب دیا:-

"حضور مجھے اپنے پیارے باپ کا غم ہی کیا کم تھا جو اس قید خانے کی مصیبت نازل ہوئی ہے"۔

بادشاہ نے متعجب ہو کر پوچھا:-

"تم قید خانے میں نہیں محل میں ہو۔ تمھیں ہر طرح کا آرام ہے۔ کھانے کو لذیذ غذائیں، پہننے کو رنگ برنگ کے بہترین لباس اور آرائش کے لئے جواہرات کے گہنے! اس سے بڑھ کر تم کیا چاہتی ہو؟"

دہقان زادی نے عرض کیا:-

"یہ سب میرے لئے بیکار ہیں۔ میں اس تنگ و تاریک قید خانے کی تنہائی سے بیزار ہوں۔ مجھے جنگل کے کھلے میدان، لہلہاتا ہوا سبزہ، بہتا ہوا صاف و شفاف پانی، طرارے بھرتی ہوئی ہوا اور سب سے بڑھ کر آزادی چاہیے۔ خدا کے لئے مجھے آزاد کر دیجیے، میں اس قید کو..........."

بادشاہ خود بھی اپنے آپ کو مقید محسوس کرتا تھا۔ اس کا دل بھی آزادی چاہتا تھا مگر وہ بادشاہت کی امانت کو سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ مجبور تھا۔ ورنہ کبھی کا آزاد



پنڈت اکنا - پیشکار حیدرآباد

ہو جاتا۔ لڑکی کہے جارہی تھی مگر اب اس کا دماغ کسی اور خیال، کسی اور فضا میں محو ہوگیا تھا۔ وہ اب گولکنڈہ میں نہ تھا۔ اس کو اپنے بچپن کی زندگی یاد آگئی تھی۔ اسکی ابتدائی زندگی کے چودہ سال اُس کی آنکھوں میں پھر گئے۔ اس نے گولکنڈہ میں قدم رکھنے کے بعد آج سب سے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ اس عظیم الشان سلطنت، ان پُرتکلف محلات، اور اس شاہی طمطراق کے باوجود اس کو وہ آزادی نصیب نہیں ہے جس کے لئے یہ غریب دوشیزہ تڑپ رہی ہے۔ اطاعت گذار خادموں اور جاں نثار امیروں کے جھگھٹے میں وہ خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ خیالات کی دنیا میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔

بادشاہ کے اس سکوت اور اس کی طبیعت کے اس تکدر کو دیکھ کر شاہی خدام سامنے سے ہٹ گئے اور دہقان زادی اپنی قیام گاہ میں پہنچا دی گئی۔

۴

ایک روز سرِ شام خود تاناشاہ بھاگمتی کے محل میں داخل ہوا۔ اس پُرتکلف ماحول میں غریب کسان کی لڑکی اُس کو ایک شہزادی نظر آرہی تھی۔ اُس نے اس سروِ صحرا سے کہا:۔

"تم نے میری زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ شاید تم نہیں جانتیں کہ میں بھی تمھاری طرح جنگل کی ہواؤں کا پروردہ ہوں۔ مجھے بھی یہ عالیشان محل تنگ و تاریک قید خانے نظر آتے ہیں۔ میں نے تم کو محض اس خیال سے یہاں لانے کا حکم دیا تھا کہ باپ کی وفات سے تم دنیا میں تنہا ہوگئی ہو، ممکن ہے یہاں تمھارا دل بہل جائے، لیکن تم اگر چاہتی ہو تو اب بھی آزاد ہو۔

مگر میں پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں سے نکلو گی تو کہاں
جاؤ گی اور کس طرح دنیا میں زندگی بسر کرو گی"۔

لڑکی پر بادشاہ کی اِس تلطف آمیز گفتگو کا بڑا اثر ہوا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اُس نے سر نیچے کو جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ کہا:۔

"اب دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے .... میری ماں بچپن میں مر چکی
تھی۔ میرے دونوں بھائی وبا میں چل بسے .... میں خود ہی
اب یہ سوچتی ہوں کہ تنہا اپنے کھیت کا کام کس طرح چلاؤں گی؟
نہ معلوم میرے پیارے بیلوں کا کیا حشر ہوا ہے؟"

بادشاہ نے کہا:۔

"تم آزاد ہو۔ سوچ سمجھ کر کوئی تصفیہ کر لو اور جس وقت چاہو مجھے
مطلع کر دینا کہ میں تمھیں تمھارے کھیت کی دنیا میں پہونچا دوں گا"۔

۵

پیمامنی کا محل کئی سال سے ویران پڑا تھا۔ اب جو بادشاہ نے اِس میں قدم رکھا۔ پھر سے چہل پہل اور رونق پیدا ہو گئی۔ ملکہ بھی کئی روز سے اس سنسان محل میں بات چیت اور حرکت کی آوازیں سن رہی تھی مگر اس کو حقیقت حال کا علم نہ ہوا تھا بادشاہ کا گذر ہوا تو سارے محل میں یہ خبر مشہور ہو گئی اور ملکہ کو بھی آخر کار چند ہی روز میں اصل واقعہ معلوم ہو گیا۔ وہ غصہ میں بیتاب ہو گئی اور عالم غیظ و غضب میں اپنی خادماؤں کو حکم دیا کہ پیمامنی کے محل میں بادشاہ نے جس عورت کو لا رکھا ہے اسکو پکڑ لائیں۔ خادمائیں خوف زدہ تھیں۔ ان کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ ایک طرف کا بے پناہ غیظ و غضب، دوسری طرف بادشاہ کی خفگی۔ ملکہ آپے سے باہر ہو ئی

جا رہی تھی۔ آخر ایک قدیم ملازمہ نے ہمت کر کے عرض کیا کہ :-

"میں واری جاؤں، حضور غصہ میں بے حال ہوئی جا رہی ہیں۔ دشمنوں کی طبیعت خراب ہو جائے گی آخر یہ لونڈی کس دن کے لئے ہے۔ حکم ہو تو ایسی تدبیر کروں کہ نہ وہ بدبخت باقی رہے اور نہ بادشاہ کا دل اس کی طرف مائل ہو۔ اگر حضور ذرا صبر و تحمل سے کام لیں تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی اور ہر بات ملکہ کی طبیعت کے موافق ہو جائے گی۔"

دوسری خادماؤں کی بھی ہمت بندھی، انھوں نے بھی طرح طرح کی باتیں بنانی شروع کیں۔ خدا خدا کر کے ملکہ کا غصہ تھما۔ اس کے بعد چند ہی روز میں وہ بڑھیا دہقان زادی کو زہر کھلانے کی ترکیبوں میں کامیاب ہوگئی۔

جب بادشاہ کو اس غریب لڑکی کی نازک حالت کا علم ہوا تو اس نے فوراً اطبائے شاہی کو معالجہ کا حکم دیا اور بڑے بڑے انعام و اکرام کے وعدے کئے۔ وقت زیادہ نہیں گذرا تھا غریب دوشیزہ کی جان بچ گئی، مگر وہ کئی دن تک ذبیش رہی۔ بادشاہ روز اس کی عیادت کو جاتا تھا اور اب اس نے اس کی حفاظت کے لئے اپنے خاص ملازمین متعین کر دئے تھے۔

۶

کچھ عرصہ کے بعد تانا شاہ قلعہ سلطان نگر کے آثار دیکھنے کے لئے نکلا۔ یہ وہی قلعہ تھا جس کو سلطان محمد قطب شاہ نے موجودہ سرور نگر کے قریب حیدر آباد کی حفاظت کے لئے بنانا شروع کیا تھا، مگر اس کی بے وقت کی وفات نے اس کو نامکمل حالت میں چھوڑ دیا۔ سلطان ابو الحسن تانا شاہ کا خیال تھا کہ اس قلعہ کو مکمل کر دیا جائے تا کہ حیدر آباد کے دونوں طرف دو مضبوط قلعے ہوں۔ اور اس طرح کوئی دشمن اس شہر میں قدم رکھنے کی جرات نہ کر سکے

بادشاہ نے ایک رات اور ایک دن سلطان نگر کا محل وتوع اور اس کی نامکمل فصیلوں اور برجوں کے معائنہ میں گذارا۔ وہ چاہتا تھا کہ اور دو روز قیام کرکے اس کی تعمیر کے جملہ مرحلوں کا تصفیہ کر دے۔ لیکن دوسری رات اس کو نیند نہ آئی وہ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ رات تمام وہ ٹہلتا رہا۔ اور صبح ہونے سے قبل نہ معلوم کیا خیال آیا کہ اپنے خدم وحشم کو وہیں چھوڑ چند ملازمینِ خاص کو ساتھ لے کر گولکنڈہ کا رخ کیا۔

نصف النہار سے قبل وہ اپنے محل میں پہنچ گیا اور سیدھا پیمامتی کے محل کا رُخ کیا۔ وہاں اس کے ملازمین ایک کمرے میں مقید ملے جن سے معلوم ہوا کہ دہقان زادی کو ملکہ پکڑ لے گئی ہے۔ تاناشاہ نے یہ سنتے ہی بالاخانے پر چڑھ کر ملکہ کے محل کے طرف نگاہ ڈالی وہاں صحن میں ایک درخت کی پیڑ سے دہقان دوشیزہ کو باندھ دیا گیا تھا اور اسکے اطراف لکڑیوں کا انبار تھا جس کو ابھی ابھی آگ لگائی گئی تھی۔ غریب لڑکی چیخ رہی تھی مگر وہاں کوئی اس کی مدد کرنے والا نہ تھا بلکہ الٹا اس کو گالیاں دی جارہی تھیں اور بڑھیا کہہ رہی تھی کہ تیری سزا تو اس سے زیادہ سخت ہونی چاہئے تھی۔

بادشاہ نے بالاخانہ ہی سے آواز دی کہ خبردار جو لڑکی کو ضرر پہنچنے پائے۔ بادشاہ کی آواز سنتے ہی سب گھبرا گئے اور بے تحاشہ بھاگ نکلے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ بادشاہ کئی روز کے لئے قلعہ سے باہر گیا ہوا ہے اور وہ اُس وقت واپس آئے گا جب لڑکی کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے گا۔

اس اثناء میں بادشاہ کے ملازمین خاص جو اس لڑکی کی حفاظت کے لئے متعین کئے گئے تھے اور جنھیں بہ وقت تمام مقید کرکے ملکہ کے ملازمین لڑکی کو کشاں کشاں لے گئے تھے پہنچ گئے۔ انھیں خود تاناشاہ نے آزاد کیا تھا۔ ملکہ کے محل میں پہنچتے ہی انھوں نے دوڑ کر دوشیزہ کی رسیاں کھول دیں۔ لڑکی کے کپڑے جل رہے تھے۔ بدقت تمام

آگ بجھائی گئی۔ تاناشاہ نے قریب آکر لڑکی کو دیکھا۔ وہ آگ کی دہشت سے حواس باختہ ہو چکی تھی بادشاہ کو دیکھتے ہی اس نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔

جب لڑکی کو ہوش آیا تو اس نے معلوم کیا کہ وہ گولکنڈہ کے عالیشان محل کی جگہ ایک کھلی بارہ دری کے میدان میں لیٹی ہوئی ہے۔ وہ حیران تھی۔ جنگل کی آزاد ہوائیں چل رہی تھیں اور دور دور تک سبزہ ہی سبزہ نظر آرہا تھا۔ اس کو پریشان دیکھ کر ایک خادمہ نے آہستہ سے کہا:۔

"بادشاہ نے تم کو بھیاماتی پیٹھ کی شاہی بارہ دری میں منتقل کر دیا ہے اور وہ ابھی تمھاری عیادت کے لئے آنے والے ہیں"۔

جب کئی ہفتوں کی نگہداشت کے بعد لڑکی پوری طرح صحت مند ہو گئی تو اس کو غسلِ صحت کرایا گیا اور اس روز بادشاہ بھی اس غریب لڑکی کو صحت یابی کی مبارک باد دینے کے لئے بھیاماتی پیٹھ پہنچا۔ اثنائے گفتگو میں اُس نے اِس سروِ صحرا سے کہا:

"اب تم آزاد کر دی گئی ہو تمھارا کھیت یہاں سے بالکل قریب ہے اور تمھارے بیل بھی محفوظ ہیں مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تم کو ناحق دو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، اور یہ دونوں ایسی سخت اور مہلک تھیں کہ تمھاری جگہ اگر کوئی محلات کی پروردہ ہوتی تو ختم ہی ہو جاتی۔ تمھاری ہمت اور قوتِ برداشت قابلِ تعریف ہے"۔

دہقان دوشیزہ نے دست بستہ عرض کیا کہ :۔

"حضور نے دو دفعہ میری جان بچائی ہے، اور میری تیمار داری میں جو زحمت اٹھائی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ میں عمر بھر کے لئے

ظل اللہ کی لونڈی بنی رہوں۔ میری تمنا ہے کہ حضور ہی کی خدمتگزاری
میں میری بقیہ زندگی صرف ہو جائے بشرطیکہ حضور بھی اِس غریب
کو اِس قابل سمجھیں "۔

لڑکی کی شریفانہ گفتگو، اس کا میٹھا چہرہ، اسکی بیمار آنکھیں، اسکا سروجیسا بلند و بالا قد، اور اسکی سادگی و پرکاری بیمامتی پیٹھ کے رومان آفرین ماحول میں حسن و لطافت کا اضافہ کر رہی تھیں۔ بادشاہ کے دل میں عشق و محبت کی بجھی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ وہ شاید منتظر تھا کہ کوئی اس کے تشنۂ مضراب ساز کو چھیڑ دے۔ اِس سروِ صحرا نے اُس کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کر دیا۔ اس کے جذبات پر بجلی گری۔ اس نے کہا:۔

"تمھاری ان پریشانیوں کی وجہ سے مجھے تمھارے ساتھ ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ تم نے اپنی ہمت اور کردار سے ثابت کر دیا کہ میرے لئے تم سے بہتر رفیق اور کوئی نہیں مل سکتا۔ ابتک دنیا میں اپنے آپ کو اکیلا سمجھتا رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ تمھاری وجہ سے میرا یہ احساس تنہائی دور ہو جائے کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ میری اور تمھاری زندگی میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ تم نے بھی جنگل میں پرورش پائی اور میں نے بھی اپنی عمر کا ابتدائی زمانہ اسی آزاد ماحول میں گذارا ہے۔ تم بھی یکایک محل کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دی گئیں اور مجھے بھی اسی طرح یکایک یہ بھیس اختیار کرنا پڑا۔ میں سمجھتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے غیب سے تم کو بھیجکر ایسے اسباب پیدا کر دئے تاکہ میری یہ مصنوعی زندگی حقیقت اور اصلیت کی جھلکوں سے محروم نہ رہے۔"

۸

بیمامتی پیٹھ کی شاہی بارہ دری کئی سال سے ویران رہنے کے بعد اِس غریب

دہقان زادی کی وجہ سے پھر آباد ہو گئی حسن و عشق کی سرگرمیاں ہر خرابہ میں رونق پیدا کر دیتی ہیں۔ بادشاہ ہر جمعرات کو قلعہ سے آیا کرتا اور ایک رات اور ایک دن اس آزاد دنیا میں بے تکلف زندگی گزار کر بعد نماز جمعہ قلعہ کو واپس ہو جاتا جہاں پانچ چھے روز تک اس کو ایک مدبر بادشاہ کا بھیس اختیار کر کے قطب شاہوں کی اس عظیم الشان سلطنت کے کاروبار انجام دینے پڑتے تھے۔

کئی سال تک غریب دہقان زادی اپنے محسن بادشاہ کے دل کو گرماتی رہی اس کا فکرمند دل اس سرو صحرا کی سادگی و پرکاری سے غنچہ کی طرح کھل جاتا۔ وہ جب تک اس کے ساتھ رہتا شاہی وقار و تمکنت کو بھولا ہوا رہتا۔ اُس کے پیشرو تاجدار گولکنڈہ نے ملک کی سیاست میں جو پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں ان کو سلجھاتے رہنے میں چھے روز تک اس کے دل و دماغ پر جو گرانی سی چھائی رہتی وہ سب بھاگمتی پیٹھ میں داخل ہوتے ہی حرف غلط کی طرح محو ہو جاتی۔ لیکن تاناشاہ کی قسمت میں عیش و آرام سے زیادہ رنج و غم کا حصہ تھا۔ قدرت کو منظور نہ تھا کہ اس سرو صحرائی سے وہ زیادہ دن تک لطف اندوز ہو سکتا۔ زہر اور آگ کے حادثوں کی وجہ سے دہقان زادی کی صحت میں گھن لگ گیا تھا اس کو اندرونی طور پر حرارت آتی رہتی تھی۔ وہ روز بروز نحیف ہوتی گئی۔ آخرکار ایک وقت ایسا آیا کہ بادشاہ نے اسکی صحت کو خطرہ میں محسوس کیا۔ شاہی طبیبوں نے اس کا بہت کچھ علاج کیا لیکن اسکی حالت خراب ہوتی گئی۔ وہ بستر مرگ پر لیٹی ہوئی تھی وہ محسوس کر رہی تھی کہ اب اپنے محسن بادشاہ سے جدائی کا وقت قریب آگیا ہے اُس نے اپنی خادمہ کو اشارہ کیا جس نے بادشاہ کے قدموں کے پاس پانچ کشتیاں لا کر رکھ دیں۔

غریب دہقان زادی نے بھرائی ہوئی آواز میں بادشاہ سے عرض کیا۔

"میں اپنی ہر چیز بادشاہ کے قدموں پر نثار کرچکی ہوں یہ آخری امانت ہے جس کو پیش کر کے میں حضور سے اپنے اس قصور کی معافی چاہتی ہوں کہ اس کو ابتک چھپائے رکھا۔ یہ وہ جواہرات ہیں جو مجھے اس بارہ دری کے ایک مقفل کمرے میں محفوظ ملے تھے۔ یہ شاید بھیامتی کی دولت ہے جس نے اپنے آقا سلطان عبداللہ قطب شاہ سے حاصل کرکے اس کو یہاں محفوظ کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں وہ مشہور ہیرے بھی ہیں جن کی وجہ سے مرحوم بادشاہ اور دغاباز میر جملہ کے آپس میں ناچاقی ہو گئی تھی۔"

۹

غریب دہقان زادی کی وفات کا تاناشاہ کو بے حد صدمہ ہوا۔ وہ پھر سے خود کو دنیا میں اکیلا محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن ہر جمعرات کی شام کو وہ حسب عادت بھیامتی بیٹھ آتا اور اپنی اس رفیق زندگی کی یاد میں ایک رات اور ایک دن بسر کیا کرتا۔ گولکنڈہ کی سلطنت کی طرح اس سرو صحرا کے دئے ہوئے ہیروں اور جواہرات کو بھی وہ ہمیشہ امانت سمجھتا رہا اور ان دونوں کو آخر وقت تک سنبھالے رکھا۔ اسکی دیانت کا تقاضہ تھا کہ اُن کی حفاظت کے لئے مردانہ وار مقابلہ کرتا۔ ورنہ وہ پہلے ہی روز اورنگ زیب سے صلح کر کے قطب شاہی سلطنت اور گولکنڈے کے ہیرے اُس کے حوالے کر دیتا۔ تاناشاہ کی نظر میں اِن دونوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔



پنڈت سادزا دیوان حیدرآباد

انار کے چودہ دانے

سنہ ۱۰۹۰ھ

"کیسا رسیلی آواز آرہی ہے"! گولکنڈہ کے محبوب بادشاہ نے آخری کاغذ پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔ داد محل کا دیوان خانہ خوش وضع امیروں اور سلیقہ مند خدمت گاروں سے معمور تھا۔ بادشاہ کی پوشاک، تخت گاہ کی آرایش، قالینوں کی رنگا رنگی، پردوں کے نقش و نگار، امیروں کے حفظِ مراتب، درباری آداب، خادموں کی مستعدی غرض ہر چیز اور ہر بات میں ایک خاص شایستگی اور سنجیدگی نمایاں تھی۔

جب مادنّا نے تمام کاغذات سمیٹ لئے، اور بادشاہ صبر آزما تحریری کام سے فراغت حاصل کر چکا تو امرائے عظام کی طرف ایک متبسمانہ نگاہ ڈالی اس اثناء میں نغموں کی بھی کچھ دھیمی دھیمی لیکن سُریلی آوازیں آنے لگی تھیں۔

"کیسا رسیلی آوازیں آرہی ہیں!" اس کی زبان سے استفسار کے طور پر پھر نکلا۔

میر بخشی سر جھکائے نگاہیں نیچی کئے اور ہاتھ باندھے ہوئے آگے کی طرف بڑھا اور مودبانہ لہجہ میں عرض کیا:۔ "بندہ پرور! چار محل کے حوض کے اطراف دھمّس کیجا رہی ہے۔ مزدور نیوگ گانے کی آواز ہے"

"محنت و مشقت کو عیش و عشرت بنا لینے کا کیا بہترین طریقہ ہے" بادشاہ نے اُٹھتے ہوئے کہا اور اُمراء کا سلام لیکر بالا خانہ کی طرف بڑھا۔ مقربان خاص ساتھ ہو گئے۔

"اور حضور! ان کے دھمّس کرنے میں بھی کچھ ایسی دلکشی ہوتی ہے کہ دیکھنے والا گھنٹوں محو ہو جائے"۔ ایک مقرب خاص نے آہستہ سے قریب پہنچ کر عرض کیا۔

"تم کو ناچ کا لطف آتا ہوگا"۔ بادشاہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

بالاخانے سے چارمحل کی تمام نئی نئی رنگین عمارتیں ہتھیلی میں نظر آرہی تھیں اور ان کے درمیان وسیع حوض کا صاف وشفاف پانی، آئینہ کی طرح قطب شاہوں کے اس آخری تعمیری کارنامہ کو منعکس کر رہا تھا۔

"کس قدر جلد یہ محل تیار ہو گیا!" بادشاہ نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"ہم بہت جلد انشاء اللہ اس میں منتقل ہو جائیں گے"۔

مقرب خاص نے عرض کیا "حضور ان کے ناچ سے ضرور محظوظ ہوں گے"

"تم کو اپنی کا خیال لگا ہوا ہے"۔ بادشاہ نے پلٹ کر کہا "اگر تمھاری ایسی ہی خواہش ہے تو کل اس کے لئے انتظام کرا دو"۔

۲

دوسرے روز موسیٰ ندی کے کنارے چارمحل کی سربفلک عمارت سرشام ہی سے اہل شہر کی تماشا گاہ بن جاتی ہے ہر محراب بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ چارمحل کے درمیان کا عظیم الشان حوض پانی سے لبریز ہے اس کے اطراف روشنی اور آتش بازی کے غیر معمولی انتظامات کئے گئے ہیں۔ رنگ برنگ کے قمقموں کا عکس متحرک پانی میں عجیب دلفریب منظر پیش کر رہا ہے۔ حوض کی کشادہ سیڑھیوں کے نزدیک ایک سفید براق کشتی بادشاہ کے انتظار میں کھڑی ہے اس کے چاروں طرف چاندی کے تختے مڑے ہوئے ہیں ہاتھی دانت اور سیپیوں کے نقش ونگار ہیں۔ چراغوں کی شعاعوں سے جواہرات کا دھوکا ہو رہا ہے۔ حوض کے ہر پہلو میں چراغوں کی قطاروں کے درمیان دھمس کرنے والی چاق وچوبند مزدورنیاں ایک ہی وضع کے تاش کا چست لباس پہنی پریوں کی طرح پرا جمائے کھڑی ہیں۔ ان غریبوں کی خوش قسمتی پر محل کی اصیلیں اور اور کا ماٹنیں رشک کے دریا میں ڈوب رہی ہیں آج اُن کی بن آئی ہے کیونکہ بادشاہ تاش کے قیمتی جوڑے کے علاوہ سیم وزر کی ایک ایک تھیلی بھی عطا کرنے والا ہے اور یہ سب کچھ انکی

عمر بھر کی کمائی سے زیادہ قیمتی ہے۔ گولکنڈہ کے مزدور بھی بڑے خوش قسمت تھے۔ آغازِ شباب ہی میں شاہی عمارتوں کی تعمیر کی بدولت غیر معمولی انعام و اکرام میں اتنا کما لیتے کہ برسوں مزدوری کا نام نہ لیتے اور اس فارغ البالی کا یہ نتیجہ ہوتا کہ تلاش کرنے پر بھی مزدور کا ملنا دشوار ہو جاتا۔

جب عشاء کی نماز ختم ہو گئی اور چراغ اپنی بہار دکھانے لگے تو بادشاہ کی آمد آمد کی دھوم مچ گئی۔ فراشوں نے دیکھنا شروع کیا کہ کہیں فرش پر تو کوئی شکن نہیں رہا ہے مشعلچیوں نے روشنی کا ایک اور دفعہ جائزہ لیا، آتش بازی والے اپنی اپنی جگہ بتوں کی طرح استادہ ہو گئے اور تاش پہنی ہوئی شوخ و چالاک مزدورنیاں اپنی اپنی پوشاک اور سج دھج کو درست اور اپنے جسم کے ہر ابھار کو نمایاں کرنے میں منہمک ہو گئیں وہ اس وقت خوشی و انبساط کی وجہ سے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ کیونکہ بادشاہ سلامت بہ نفسِ نفیس ان کی کارگزاری ملاحظہ کرنے کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔

اُدھر ڈیوڑھی کے سپاہیوں نے باہر سلامی دی اور یہاں ساکت و صامت مجمع متحرک ہو گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جادو کے زور سے بے جان پتلوں میں جان آ گئی ہے قسم قسم کی آتشبازیوں کا چھوٹنا مزدورنیوں کا سُریلی آواز میں گانا اور حوض کے اطراف میں دھمس کرنا بیک وقت شروع ہو گیا اور ابھی بادشاہ کشتی میں سوار نہ ہونے پائے تھے کہ آتشبازی کے رنگارنگ مصنوعی درخت، جانور اور انسان حرکت کرنے لگے دھمس کرنے والیوں کی بل کھاتی ہوئی کمریں اور مستانہ انداز میں حرکت کرنے والے پاؤں زیر و بم کی عجیب کیفیت پیدا کر رہے تھے چراغوں اور آتشبازی نے وہ سماں پیش کر دیا تھا کہ ناچنے والی سرمست شباب لڑکیوں کے زرنار لباس کہکشاں کے مانند جگمگا رہے تھے۔ اُن کی سُریلی آواز اور تھرکتی چال قدم قدم پر بجلیاں گرا رہی تھی۔ روشنی کے انعکاس میں ان کے جسم کا ایک ایک عضو شاخِ نخلِ طور کی طرح نظر آ رہا تھا اور شبہ ہوتا تھا کہ آیا یہ انسان ہیں یا انسان نما نور کی پتلیاں۔

ہر دل عزیز تاناشاہ کشتی میں سوار دریائے محویت میں غرق ہے اس عالم سرخوشی میں اس کے پیرو مرشد کی خانقاہ سے اس کے زمانۂ فقر و فاقہ کا ایک لنگوٹی یار، چار محل کے دروازہ پر پہنچتا ہے۔ امراء اس وقت بادشاہ کے دربار عیش و انبساط میں ایک چیتھڑے لگائے ہوئے درویش کی باریابی کیونکر پسند کر سکتے؟ پہرے کے سپاہیوں نے اس کو وہیں روک لیا۔ درویش ماننے والا انسان نہ تھا۔ آزادوں کو اس طرح کی بندشیں کب گوارا ہوتی ہیں؟ اس نے وہیں سے اپنے پرانے یار غار کو آواز دی۔

دور سے "تانے شاہ تانے شاہ" کی آواز سن کر بادشاہ چونکا ہوا۔ اس نے خیال کیا کہ شاید ایک لمحہ کے لئے میری آنکھ لگی تھی اور میں نے خواب میں اپنے قدیم ساتھی کو پکارتے سنا۔ مگر پھر وہی آواز سنائی دی۔ اب زرپوش رقص کرنے والیوں کے نغمے آتشبازی کا شور، باجوں کی گونج غرض ہر جگہ سے اس کو "تانے شاہ تانے شاہ" کی آواز نکلتی ہوئی سنائی دینے لگی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا حوض کے کنارے اُمرائے دربار کے درمیان واقعی اس کا پرانا دوست 'چندا شاہ' اس کو پکار رہا ہے اور وہ سب اس کو منع کر رہے ہیں۔

بادشاہ کی کشتی فوراً کنارے آ گئی۔ فقیر اس میں کود پڑا۔ سارا مجمع اس کا منہ تکتا رہ گیا فقیر نے اپنی جھولی سے ایک انار نکالا اور اپنے قدیم دوست کے آگے پیش کرتے ہوئے کہا:۔

"پیرو مرشد نے بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ جہاں کہیں پاؤں تمھیں یہ انار سالم کا سالم کھلا کر واپس آؤں"۔

ابوالحسن قطب شاہ ایک میلے کچیلے چیتھڑے لگے ہوئے فقیر سے بغل گیر ہوتا ہے اور اپنے پیر کے بھیجے ہوئے انار کو سر آنکھوں پر رکھ کر اس میں سے پانچ دانے نکالتا ہے لیکن انکو منہ میں ڈالنے کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ انار کھٹا ہے۔ تھوک دینے کی مجال نہ تھی۔ مشکل سے نگل گیا۔ مگر فقیر اسی پر چپ رہنے والا تھوڑا ہی تھا۔ اس نے مجبور کیا۔ بادشاہ نے اسکی مروت

اور قدیم تعلقات کی بنا پر پانچ دانے اور کھائے فقیر نے پھر اصرار کیا۔ بادشاہ نے کہا۔

"بھائی تم اس کو یہاں چھوڑ جاؤ میں پھر کھالوں گا۔"

"کیا کہا! تاناشاہ! پیرو مرشد قبلہ کی عدول حکمی کروں۔ چنداشاہ کے ساتھ تم اتنے سال رہے! کبھی مجھ سے ایسا گناہ سرزد ہوا؟"

تاناشاہ اور چنداشاہ کے آپس کا معاملہ تھا۔ مقربان خاص کو بھی دخل دینے کا یارا نہ تھا۔ آخر کار تاناشاہ نے کہا "میں کب عدول حکمی کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں" میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کو کھالوں گا مگر اس وقت طبیعت مائل نہیں ہے۔ کسی اور وقت۔"

"بھائی مجھے تو یہ حکم ہے کہ اسی وقت سب کھلا دو۔ ورنہ واپس لے آؤ۔ یہ لو تم اس وقت تو یہ چار دانے اور کھالو۔ میں حضرت قبلہ سے اجازت لے آتا ہوں کہ بقیہ انار بعد میں کھانے کے لئے چھوڑ آؤں۔"

فقیر" شاہ راجو صاحب کی بارگاہ میں ایک آن میں پہنچ گیا" تاناشاہ نے پورا انار کھالیا۔" پیرو مرشد نے چنداشاہ کو دیکھتے ہی دریافت کیا۔

"جی۔ جی۔ حضور طبیعت اچھی نہ تھی۔ چند دانے کھائے ہیں اور کہا ہے کہ بعد میں کھالونگا اجازت ہو تو یہ انار اس کے یہاں رکھ آؤں" چنداشاہ نے کانپتے ہوئے عرض کیا۔

"آخر کتنے دانے کھائے کمبخت نے؟" مرشد نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"جی ...... پانچ۔ پانچ۔ چار، چودہ دانے کھائے ہیں۔"

"افسوس" مرشد کی زبان سے اندوہناک لہجہ میں نکلا" اس کی قسمت میں چودہ سال ہی کی بادشاہت تھی۔"

اورنگ زیب اور تاناشاہ

سنہ ۱۰۹۸ھ

"اچھا تو نماز ہو رہی ہے!"

تاناشاہ نے کہا اور ساتھ ہی اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ مغل ہمارے نشانہ بازوں کی اتنی تحقیر کریں گے! قلعہ کے اس قدر قریب اور ہمارے تیر و تفنگ کی زد میں کھڑے ہو کر نماز با جماعت ادا کرنا مصلحت اور دور اندیشی سے یقیناً بعید ہے!! کیا اورنگ زیب جیسا دور اندیش اور ہوشیار بادشاہ بھی غلطی کر سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں یہ ایک صریحی تحقیر ہے دیکھنا ہے کوئی یہاں اچھا نشانہ باز؟"

۲

اورنگ زیب کئی مہینوں سے گولکنڈہ کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ مغل فوجیں چاروں طرف سے ایک مہیب سمندر کی پر جوش موجوں کی طرح قلعہ کی فصیلوں سے آ آ کر ٹکراتی ہیں اور ہر ہر دفعہ دکنی سپاہی پہاڑوں کی چٹانیں بن کر انھیں پیچھے ہٹا دیتے ہیں۔ اس وقت آفتاب کی تمازت میں خاصی کمی ہو گئی ہے اور مغلیہ لشکر اپنی پوری قوت کے ساتھ حملوں پر حملے کئے جا رہا ہے۔ ان صفوں کے ذرا پیچھے دو تین ہموار قطاریں نظر آتی ہیں کیونکہ اورنگ زیب اور اس کے کئی مصاحب ابھی ابھی نماز کے لئے صف بستہ کھڑے ہیں۔

چند لمحے گذرنے نہیں پاتے کہ امام یکایک تڑپ کر آگے کی طرف گر پڑتا ہے۔

۳

"خوب! شاباش!! امام رکھ لیا۔ دیکھنا صف میں سے ایک اور شخص

امامت کے لئے آگے بڑھ رہا ہے ..... ہاں چھوڑنا نہیں کوئی امام
نہ بچے .... اس کو کہتے ہیں انتقامِ تحقیر!!"

شاہی حکم بجلی بن کر دوسرے امام پر گرتا ہے اور وہ بھی دکھنی گلنداز کا نشانہ ہو جاتا ہے۔

دو تین پیش اماموں کے یکے بعد دیگرے اس طرح نذر اجل ہو جانے کے بعد امامت کے لئے صف میں سے آگے بڑھنا کسی معمولی دل و دماغ والے کا کام نہیں! اس سرے سے اس سرے تک پس و پیش کا ایک عجیب عالم چھا جاتا ہے لیکن ابھی چند لمحے بھی گذرنے نہیں پاتے ہیں کہ خود اورنگ زیب امامت کے لئے آگے بڑھتا نظر آتا ہے اور اب گولکنڈہ کا شاہی نشانہ باز بندوق خالی کرنے ہی کو ہے کہ تاناشاہ لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

"ظالم! کیا ایک بادشاہ کو بھی نشانہ بنائے گا؟ دکھائی نہیں دیتا
کہ خود اورنگ زیب اس وقت امام ہے!!"

کاغذی برج

سنہ ۱۰۹۸ء

"تین ہفتوں سے مسلسل گولہ باری ہو رہی ہے لیکن اب تک مسمار نہیں ہو سکا!"
یہ تھے وہ الفاظ جو ہر خوف زدہ سپاہی کی زبان سے نکل رہے تھے۔

"اور توپ خانے کے کتنے گلنداز نذر اجل ہو چکے ہیں! ہمارے ہر گولے کے جواب میں برج کی طرف سے برابر گولے چلے آ رہے ہیں۔ کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری گولہ باری نے برج کی توپ اور اس کے چلانے والوں کو ختم کر دیا ہے لیکن ایک لمحہ گزرنے نہیں پاتا کہ پھر وہاں سے گولے برسنے شروع ہوتے ہیں گولکنڈہ کے جادوگروں نے اس برج پر جادو تو نہیں کر دیا!!"
مغل گلندازوں نے متفقہ آواز میں اپنے سرگروہ سے کہا جو ابھی ابھی شاہی خیمہ سے واپس ہوا تھا۔

ہشیار! خبردار! دیکھنا پھر گولہ..... بھاگو، ہٹو، وہ گرا..... اُوہو!...:
صف افگن توپ کو نشانہ بنایا ہے..... بچاؤ..... دوڑو ابھی بہتوں میں جان باقی ہے۔ اٹھاؤ... خیموں کی طرف... چلو... لے چلو۔"

"پیر و مرشد کئی روز سے گولکنڈہ کے اس برج کے گولندازوں نے ہم کو پریشان کر رکھا ہے۔ متعدد توپیں ناکارہ ہو چکیں۔ سیکڑوں سپاہی ہلاک ہو گئے" رات کو اورنگ زیب سے سپہ سالار نے اُس وقت عرض کیا جب وہ بعد مغرب حسب معمول اپنے لشکر اور مورچوں کے معائنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ جہاں پناہ نے حکم دیا کہ:۔

کل صبح اس رُخ کے جملہ مورچوں کی توپیں اسی برج کو اپنا نشانہ بنائیں اور یاد رکھنا آفتاب نصف النہار تک پہنچنے نہ پائے کہ برج کا نشان باقی نہ رہے"

پھر چند لمحوں کے سکوت کے بعد کچھ سوچ کر بادشاہ نے سپاہیوں کی اسطرح ہمت افزائی کی کہ۔

"ہم کل شام تک انشاءاللہ قلعہ میں داخل ہو جائیں گے"۔

بادشاہ کا ایک ایک لفظ کئی ماہ کے تھکے ماندے جانبازوں میں زندگی کی برقی رَو دوڑانے کے لئے کافی تھا۔

— ۳ —

رات بھر برج کے مقابل کا میدان زندگی اور حرکت کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ فلک بوس برج کے محافظوں اور گولندازوں کی نیند بار بار میدان کی آوازوں سے اچاٹ ہو جاتی اور ان میں سے اکثر کئی دفعہ نیچے خندق تک گشت لگا آئے کہ کہیں ایسا نہ ہو غنیم کا لشکر برج کے نیچے تک پہنچ گیا ہو یا سرنگوں کے ذریعہ سے برج کو اُڑا دینا چاہتا ہو۔ انکو خبر نہیں تھی کہ یہ ان کی زندگی کی آخری رات ہے۔ یہ خوش قسمتی اکثروں کیلئے قابل رشک تھی کہ اپنے ملک کی تباہی اور بادشاہ کا زوال دیکھنے کیلئے وہ زندہ نہیں رہے۔

صبح ہوتے ہوتے قطب شاہی محصورین نے معلوم کر لیا کہ رات کا شور و غل کیا معنی رکھتا تھا۔ برج کے مقابل کا میدان جو کل آفتاب غروب ہونے سے قبل تک ایک وسیع ہرا بھرا مرغزار نظر آتا تھا آج آفتاب طلوع ہونے سے قبل ریت ٹیلوں اور تھیلوں سے بنائے ہوئے مورچوں کی وجہ سے ایک دوسرا قلعہ بن گیا تھا۔ مغلوں کی ہمّت حیرت ناک تھی کہ چند گھنٹوں میں رات کے وقت چٹیل میدان کو ایک مضبوط قلعہ کی شکل میں منتقل کر دیا۔ برج کے نگہبانوں کی نظریں جہاں تک کام کر سکتی تھیں ہر طرف سپاہی، توپیں اور سامان حرب کا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ ساری دنیا اُن کے مقابلے پر اتر آئی ہے۔ جس توپ پر نظر پڑتی انہی کے برج کی طرف اُس کا رُخ دکھائی دیتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چشم زدن میں وہ اور اُن کا برج مغلوں کی گولہ باری سے نیست و نابود ہو جائیں گے۔

صبح صبح نگہبانوں نے برج کے تمام سپاہیوں اور گولندازوں کو صورت حال کی نزاکت سے آگاہ کیا۔ آثار تو ایسے تھے کہ شیر دل سے شیر دل کی ہمّت پست ہو جاتی مگر معلوم نہیں کہ اس برج کے محافظوں کے سینے میں کیسے دل تھے کہ ان پر مطلق اثر نہ ہوا۔ وہ پہلے سے زیادہ

پھرتی کے ساتھ اپنے فرائض میں مشغول ہوگئے اور ابھی مغل مورچے والے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ گولکنڈہ کے ان جانبازوں نے اُن کی کئی توپوں کی نشستیں بگاڑ دیں۔ اورنگ زیب کا حکم تھا کہ نماز صبح کے ختم کے ساتھ ہی حملہ کیا جائے۔ مغلوں نے شاید اس امر کا اندازہ نہیں کیا کہ اپنی جان پر کھیلنے والے نماز کا انتظار نہیں کرتے۔

برج والوں کی نازک حالت کی خبر قلعہ میں ہر طرف پھیلنے لگی۔ اور ابھی مغل توپوں کا پہلا گولہ قلعہ کی طرف آنے بھی نہ پایا تھا کہ متعدد سرباز اہل برج کی مدد کے لئے پہنچ گئے اور برج کے دونوں طرف کی فصیلیں توپوں اور گولندازوں سے معمور ہوگئیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مغلوں اور قطب شاہیوں کی تمام معرکہ آرائی صرف اسی ایک نقطہ پر سمٹ آئی ہے۔

۴

ابتداء میں مغل فوجیوں نے ہمت ہار دی۔ ان کو توقع نہ تھی کہ اس اہتمام کے بعد بھی قطب شاہی گلنداز مقابلے میں ٹک سکیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ پیرو مرشد نے دوپہر تک کی مہلت دی ہے ہم تو اس برج کو نو دس بجے تک ہی مسمار کردیں گے۔ مغلوں کے لئے سب سے بڑی پریشانی اس وجہ سے تھی کہ ان کا مطمح نظر صرف برج تھا اور اس کی طرف انھوں نے اپنی جملہ توپوں کے رخ پھرا رکھے تھے اب جو برج کے دونوں بازوؤں سے بھی ان پر ایک ساتھ گولہ باری شروع ہوئی تو قریب تھا کہ وہ اپنے رات بھر کے تیار کئے ہوئے مورچے چھوڑ کر بھاگ نکلتے مگر قسمت ہمیشہ فاتحیں کا ساتھ دیتی ہے۔ اورنگ زیب بہ نفس نفیس اس طرف پہنچ گئے اور اپنے ساتھ تازہ دم گلنداز لیتے آئے اور ادھر قلعہ میں غداروں نے یہ غلط خبر اڑا دی کہ مغل مشرق کی طرف سے فصیل توڑ کر اندر گھس آئے ہیں۔ پھر کیا تھا لڑائی کا پانسا پلٹ گیا اور دوپہر کے قریب قطب شاہی جاں بازوں کے ہاتھ قابو سے باہر ہونے لگے ان کے دل بیٹھے جا رہے تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا برج کے ہر سپاہی نے تہیہ کرلیا تھا کہ یا تو مغلوں کو مورچوں سے بھگا دوں گا یا خود برج کی حفاظت میں جان دیدوں گا۔

کاش گولکنڈہ کے دوسرے سپاہی بھی برج کے ان سرفروش محافظین کی طرح اپنے عزم و استقلال پر قائم رہ سکتے۔

سہ پہر تک گولکنڈہ کی توپیں اطمینان سے مقابلہ کرتی رہیں لیکن جیسے جیسے آفتاب غروب ہو رہا تھا گولکنڈہ کی قسمت بھی زوال پر آمادہ ہوتی جاتی تھی اور قطب شاہیوں کی سطوت پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ آخر کار نماز مغرب کے قریب مغل توپوں کی دھواں دھار بارش کے جواب میں اس منہدم شدہ برج کا آخری گولہ نکلا پھر اس برج کی توپیں ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگئیں اور اسکے جملہ گلنداز نذر اجل ہو گئے۔

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا!

کیا برج والوں کا یہی کارنامہ کچھ کم قابل داد ہے کہ دوپہر کے عوض غروب آفتاب تک مغلو کی فوج کو سرگرم بیکار رکھا، اور شہنشاہ اورنگ زیب کا حکم معرض التواء میں رہا۔

مغرب کی نماز کے وقت مغل مورچہ والوں نے اطمینان کا سانس لیا اور ان کی مسرت کی انتہا نہ رہی جب شہنشاہ اورنگ زیب فوج کی کامیابی پر مبارکباد دینے کے لئے بذات خود مورچہ پر تشریف لائے اور فرمایا کہ :۔

"سب انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ کل دوپہر تک تم گولکنڈہ پر قابض ہو گے"

۵

رات بھر عالمگیری سپاہ ان مورچوں پر زیر سماچین کی نیند سوتی رہی۔ شاید کئی مہینوں کے بعد اس طرف کے سپاہیوں کو پہلی دفعہ اس طرح بےفکر ہو کر سونا نصیب ہوا تھا جب صبح اذاں کی آواز نے ان کو جگایا تو آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور جو چیز سب سے پہلے ان کی نظر کے آگے تھی وہ گولکنڈہ کا وہی برج تھا جس کے فتح کرنے میں انھیں ایک رات دن مصروف پیکار رہنا پڑا تھا اور بہت کچھ جانی اور مالی نقصان کے بعد اُس کو منہدم کیا تھا۔ لیکن اب دیکھتے کیا ہیں کہ ویسا ہی ایک برج اپنی سابقہ عظیم الشان کمانوں بلند ستونوں، وسیع محرابوں اور سربفلک میناروں کے ساتھ اسی مقام پر موجود ہے۔

ہر شخص یہی سمجھ رہا تھا کہ کیا میں ابھی نیند میں ہوں، اور گزشتہ واقعات کا خواب دیکھ رہا ہوں لیکن یہ بے حسی کا عالم کب تک باقی رہ سکتا؟ آخر جب حیرت کے بادل رفتہ رفتہ چھٹ گئے تو لگے اس برج کو گھورنے۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ کیا گولکنڈہ جنوں اور دیووں کی بستی ہے جو جادو کے زور سے منہدمہ برج نے سر سے کھڑا کر دیا گیا ہے؟ غریب سپاہی حیران تھے۔ اُن کے دل اس خیال سے لرزنے لگے کہ آج پھر اُسی برج کو منہدم کرنا ہے جس سے کل سابقہ پڑا تھا اور نہ معلوم یہ سلسلہ کب تک قائم رہے کیا ایک ہی برج کے سر کرنے میں سارے مغل گلنداز ختم ہو جائیں گے۔

مورچہ والوں کا یہ استعجاب نہ معلوم کب تک رہتا اگر شاہی خیموں کی طرف سے فتح و نصرت کے شادیانوں کی آوازیں سنائی نہ دیتیں۔ ادھر فتح کی توپیں سر ہونے لگیں اور ادھر شاہی نقیب گھوڑا دوڑاتا ہوا پہنچا کہ قلعہ کی مشرق رویہ کھڑکی کھل گئی ہے اور پیر و مرشد کا حکم ہے کہ فوج اسی طرف سے لڑتے بھڑتے قلعہ میں داخل ہو جائے۔

دوپہر کا وقت ہے مغل فوجیں ایک قطب شاہی سپہ سالار کی غداری سے فائدہ اٹھا کر گولکنڈہ میں داخل ہو رہی ہیں اور ایک ایک فصیل پر اپنا قبضہ جما رہی ہیں۔ کل دن بھر مصروف بیکار رہ کر برج کو منہدم کرنے اور آج صبح اس کو صحیح و سالم دیکھنے والے مغل سپاہیوں نے قلعہ میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اس عجوبۂ روزگار برج کی طرف لپکے جب وہاں پہنچے تو یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ سارا برج راتوں رات کاغذ، لکڑی اور ٹاٹ سے مصنوعی بنایا گیا ہے اور گولکنڈہ کے صناعوں اور نقاشوں نے ایک ہی رات میں اس خوبی سے یہ کام کیا ہے کہ نزدیک سے بھی اصل اور نقل میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ اس کاغذی برج کی تمام مغل فوجوں میں دھوم مچ گئی اور عرصہ تک فاتح فوج کی ٹولیاں جوق در جوق دیکھنے کو آتی جاتی رہیں۔

غیبی امداد

"وہی موسیٰ ندی کی طغیانی! گولکنڈہ اور حیدرآباد کی تاریخ اور موسیٰ ندی کی طغیانی! ان دونوں کا اتصال گویا چولی دامن کا ساتھ ہے!! کیا اس ندی کا تذکرہ کئے بغیر حیدرآباد کا کوئی واقعہ آپ نہیں بیان کرسکتے؟"

"تو کیا آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں گولکنڈہ اور حیدرآباد کے قصوں میں گنگا اور جمنا یا دجلہ و فرات کا ذکر کروں گا، معاف کیجئے۔ میں شاعروں کی طرح فرضی معشوقوں کا دلدادہ نہیں ہوں۔ میں حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے کام کے لئے مانگے تانگے کے مسالہ کی ضرورت نہیں"۔

رسالدار نے نئے قلعہ کے دروازہ میں قدم رکھتے ہوئے اپنے ہمراہیوں سے کہا۔

"اچھا رسالدار صاحب یہ تو بتائیے کہ یہ سب قصے آپ تک کیونکر پہنچے؟"

"جس طرح آپ تک پہنچ رہے ہیں! ان باتوں کو چھوڑیئے اب یہ کہئے کہ پہلے ہتیان کے درخت اور رملا خیالی کی دو منزلہ مسجد کی طرف آپ کو لیچلوں یا شاہی بارہ دری اور اورنگ زیب کے اولین مورچہ کی طرف؟"

"آپ خود جہاں چاہیں۔ ہم ان چیزوں سے واقف ہوتے تو آپ کو رہنمائی کی زحمت ہی کیوں دیتے؟" اس جماعت میں سے ایک نے رسالدار کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر مفاہمانہ انداز میں کہا۔

بات یہ ہے میرے والد قبلہ قلعہ کے ایک مشہور مرشد تھے۔ نواب افضل الدولہ بہادر کا عہد آپ جانتے ہیں بزرگوں اور اولیاء اللہ کا زمانہ تھا۔ سارے قلعے والے میرے والد کے گرویدہ تھے اور مردوں سے زیادہ عورتیں ان کی معتقد تھیں۔ میں ان کی وفات کے وقت بہت کم عمر تھا۔ مگر پھر بھی مجھے اس وقت کی چند باتیں یاد ہیں۔ میرے والد کے یہاں دُور دُور مقامات کے رہنے والے

درویش اور قلعے کے بوڑھے بوڑھے باشندے ہر روز جمع ہوتے تھے اور اپنے مقررہ وِرد و وظائف سے فارغ ہو کر اُن کو قلعہ کی قدیم داستانیں سنایا کرتے تھے۔"

"افسوس ہے کہ والد مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے یہ احباب بھی یکے بعد دیگرے دنیا سے چل بسے۔ رہے نام اللہ کا!" بوڑھے رسالدار نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

ابھی سلسلۂ کلام جاری تھا کہ یہ جماعت بارہ دری کے حدود میں داخل ہو چکی تھی اور ہم سب اس وسیع چبوترے پر پہنچ چکے تھے جس کے اطراف غلام گردش کی پست دیواریں ہوئی ہے اور جسکے ایک جانب وسیع تالاب ہے اور دوسری جانب بڑے بڑے حوض پہلو بہ پہلو دور دُور تک بنے ہوئے ہیں اس پرلطف منظر سے متاثر ہو کر ایک صاحب نے رسالدار کو جو اپنی خیالی دنیا میں گھوم رہے تھے' یہ کہہ کر چونکا دیا۔" غالباً ان شاندار حوضوں کی تاریخ بھی آپ کو معلوم ہوگی؟"

"تاریخ؟ تاریخ کسی مدرسہ کے استاد سے پوچھئے۔ مگر وہ یہ نہ بتا سکیں گے کہ اس چبوترے کے نیچے جہاں آپ کھڑے ہیں ایک اچھا خاصا محل بھی ہے ہم اس کی چھت پر چل رہے ہیں۔ یہ دراصل تالاب کا کٹہ تھا۔ لیکن گولکنڈہ کے خوش سلیقہ بادشاہوں نے کٹے سے چپساں ایک عالیشان محل بنا دیا اور محل کے سامنے کئی فرلانگ تک مسلسل حوض ہی حوض ہیں۔ تالاب کا پانی محل کے نیچے سے سامنے کے اس بڑے حوض میں آتا ہے پھر اس حوض سے دوسرے لانبے حوض میں چادر کی شکل میں گرتا ہے وہاں سے تیسرے چوڑے حوض میں جمع ہوتا ہے۔ پھر وہاں سے چوتھے لانبے حوض میں جو کسی قدر پست ہے بطور آبشار اچھل اچھل کر گرتا ہے۔ اس طرح ان چار حوضوں کو لبالب کرتا ہوا اس تالاب کا پانی آخر کار اس عظیم الشان پانچویں حوض میں پہنچ جاتا ہے جس کے بیچوں بیچ وہ دیکھئے ایک مصنوعی جزیرہ نظر آتا ہے۔ جب ان سب حوضوں کے فوارے اچھلتے ہوں گے اور آبشار سے پانی کی چادریں گرتی ہوں گی تو اس جزیرہ سے بہتر فرحت کا مقام اور کوئی نہیں ہو سکتا......"

"ہاں رسالدار صاحب چمار کا قصہ تو نا تمام ہی رہ گیا! اس کو قلعہ کی حفاظت سے کیا تعلق تھا؟ ایک صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔

"آپ حضرات ان تعلقات کو کیا جانیں؟ تو اس تفرج گاہ سے زیادہ آپ کو چمار سے دلچسپی ہے خیر لیجئے وہی قصہ سُن لیجئے"۔

خاں صاحب خود تو چبوترے پر ایک کونے میں بیٹھ گئے اور اپنے ہمراہیوں کو چبوترے کے منڈیر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جب سب بیٹھ چکے تو کہا:۔

"واقعہ یہ ہے کہ مغلوں کو محاصرہ کئے ہوئے عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ حیران تھے کہ اتنا سامان رسد قلعہ میں کہاں سے آگیا؟ ان کو یقین تھا کہ چند روز میں اہل قلعہ بھوک پیاس کی شدت سے تنگ آکر دروازے کھول دیں گے وہ اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے کہ قطب شاہیوں کی ہمت اور قوت برداشت دکن میں ضرب المثل ہے اور انھوں نے یہ ٹھان لی تھی کہ دشمنوں کے پے در پے حملوں کے باوجود بھی "قطب از جا نمی جنبد" کی مصداق بنے رہیں۔

مغل فوجیں قلعہ فتح کرنے کے لئے ہر طرح کوششیں کر چکی تھیں۔ خود بادشاہ اورنگ زیب حیران تھے کیونکہ انھیں اپنی تمام عمر میں ایسے سخت جاں حریف سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ان کا یہ شبہ یقین کے درجے تک پہنچ گیا تھا کہ اس قلعہ کا استحکام اور قلعہ والوں کی ہمت ظاہری اسباب سے زیادہ کسی نامعلوم باطنی قوت اور غیبی امداد کی تابع ہے۔ سرنگوں کے ذریعے سے فصیلوں کو منہدم کرنے کی تدبیروں کا الٹ جانا اور ان فصیلوں کے عوض مورچوں کا منہدم ہو جانا، راتوں میں سیڑھیوں اور کمندوں کے ذریعہ سے مغلوں کا فصیلوں پر چڑھنا لیکن قطب شاہی سپاہیوں کا آخر وقت پر ان کو گرا دینا، ایسے واقعات ہیں جن پر کسی بوڑھے سے بوڑھے مغل سپاہی کو اپنی عمر بھر میں کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا،...... سابقہ پڑھنا تو کجا کسی نے سنا تک بھی نہ تھا کہ مغل اعظم کے ارُدوئے معلّٰی کو کسی لڑائی میں ایسی ناکامیوں اور

پریشانیوں سے سابقہ پڑا ہو۔ شہنشاہ اورنگ زیب اور ان کے سپہ سالاروں نے اہل قلعہ کو طرح طرح کے لالچ بھی دلائے اور قطب شاہی سپہ سالاروں سے آخر وقت تک خوشامدانہ مراسلت بھی کرتے رہے۔ تاکہ اورنگ زیبی لشکر کے لئے راستہ مل جائے یا کوئی کامیاب صورت پیدا ہو جائے۔ میر جملہ کی مثال پیش کی گئی اور شاہانہ نوازشوں اور سرفرازیوں کی چاٹ بتلائی گئی۔ لیکن ہر سپہ سالار کی طرف سے یہی جواب ملتا رہا کہ:۔

"کیا میر جملہ کی غداری ہمارے لئے کم موجب ندامت ہے! کہ ہم بھی اسی کے نقش قدم پر چل کر ہمیشہ کے لئے بے ایمانی اور نمک حرامی کے الزام سے اپنا منہ سیاہ کریں۔"

اسی طرح کی اور اور کوششیں جاری تھیں کہ ایک رات موسیٰ ندی میں یکایک طغیانی آگئی وہی موسیٰ ندی اور وہی طغیانی جس کے نام سے آج بھی ہزار معلوم ہوتے ہیں گر کیا کیا جائے اس کے نام یا اس کے ذکر کے بغیر گولکنڈہ یا حیدرآباد کا کوئی واقعہ ختم ہی نہیں ہو سکتا! چند روز سے ایسی بارش ہو رہی تھی اور اس زور کی آندھی آرہی تھی کہ محاصرے کی فوج منتشر اور مورچے منہدم ہو گئے تمام شاہی خیمے اکھڑ گئے ندی کے آباد کنارے ویران ہو گئے، اور اس طوفان بادوباراں میں ہزاروں سپاہی سیلاب میں گھر کر نذرِ اجل ہو گئے مغل فوج کی یہ تباہی اہل قلعہ کے لئے جشنِ مسرت کا پیغام تھی ادھر مغلوں کے رسد خانوں، مورچوں اور ہزاروں مغل سپاہیوں پر طغیانی کی بلا نازل تھی اور ادھر قلعہ والوں نے جشن چراغاں منایا آبادی کی نشیبی فصیلوں سے لے کر بالاحصار کی بلند ترین چوٹیوں تک رنگ برنگ کے چراغ جگمگا رہے تھے۔ لیکن یہ بات سلطان ابوالحسن کو ناگوار گزری۔ انھوں نے کہا "اگر ہماری فوج سے مقابلہ کر کے مغل سپاہی ہلاک ہوتے تو مسرت کا موقع تھا لیکن ان کی اس طرح کی تباہی پر مسرت کا اظہار بہادروں کے شایانِ شان نہیں۔"

ناناشاہ نے صبح ہوتے ہوتے ایک ہزار راس بیلوں پر غلہ کے بورے بار کرا کے اپنے

ملازمین کے ہمراہ مغل فوجوں میں روانہ کیئے۔ جب یہ بیلوں کا قافلہ قلعہ سے باہر نکلنے لگا تو قطب شاہی اور اورنگ زیبی دونوں فوجیں حیران تھیں۔ قطب شاہی فوج کو شکایت تھی کہ یہ ہمدردی کا کونسا موقع ہے ہمارے ظل اللہ کو میدانِ جنگ میں بھی دشمنوں کے ساتھ ہمدردی سوجھتی ہے حالانکہ مخالفین "اَلْحَرْبُ خِدْعَۃٌ" سے برابر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور ہم ہیں کہ اس وقت ہمیں اچانک حملہ کرنے کی بھی اجازت نہیں ملتی؟

غرض کئی دن تک آندھی کے گردو غبار اور سیاہ بادلوں کے گھٹا ٹوپ ہجوم سے مغل فوجوں کے خیمے ظلمت کدہ بن گئے۔ اورنگ زیب حسب معمول اس ظلمات میں بھی گشت اور فوجی معائنے کے لئے نکلتے تھے۔ ایک رات انھوں نے دیکھا کہ آندھی کی شدت کے باوجود ایک مقام پر چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر آرہی ہے کچھ فاصلے سے معلوم ہوا کہ مغل فوج کے دو سپاہی دنیا و مافیہا سے بے خبر قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف ہیں اور ان کے چراغ کو ہوا کے سخت سے سخت تھپیڑے بھی گل نہیں کر سکتے۔ بادشاہ نے قریب پہنچ کر کہا کہ:-

"آپ ایسے بزرگ فوج میں موجود ہوں اور فتحیابی میں اس قدر تاخیر، التعجب کا مقام ہے!!"

ان بزرگوں نے نظر اٹھا کر دیکھا کہ خود بادشاہ سلامت کھڑے ہیں ان دونوں نے یک زبان ہو کر کہا:- "ہم کو اس معاملے سے کیا تعلق؟"

"تعلق کیوں نہیں؟ آپ ہماری فوج کے سپاہی ہیں اور جانتے ہیں کہ آپکے ساتھی کئی مہینوں سے پریشان ہیں۔ آپ کو ضرور اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ کیا آپ لشکرِ اسلام کی اس سے زیادہ تباہ حالی کے منتظر ہیں۔"

"اس لڑائی کو مذہب سے کیا واسطہ جہاں فریقین اہل اسلام ہوں؟"

اورنگ زیب کو ان بزرگوں سے بہت دیر تک درشت لہجہ میں گفتگو کرنی پڑی آخر کار جب انھوں نے دیکھا کہ تلاوتِ قرآنِ پاک میں خلل ہو رہا ہے تو یوں زبان کھولی:- "ایک ٹھیکری اٹھا لائیے۔

بادشاہ بڑی تلاش کے بعد ایک ٹھیکری اُٹھا لائے۔ اس پر انھوں نے کوئلہ سے کچھ لکھا اور بادشاہ کو دے کر کہا کہ :۔

"لنگر حوض کے کنارے ایک چمار رہتا ہے یہ اس کو دیجئے اور جواب لائیے۔"

بادشاہ وہ ٹھیکری لے کر قلعہ والوں کی گولیوں سے بچتے ہوئے چمار تک پہنچ گئے۔ اس نے وہ ٹھیکری لے لی اور غصّے کی نگاہوں سے بادشاہ کو گھورنا شروع کیا اور اسی ٹھیکری کی دوسری جانب کچھ لکیریں کھینچ کر بادشاہ سے کہا :۔

"واپس لے جا۔"

بادشاہ حیران ہیں کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ کرتے کیا؟ اس راؤٹی میں واپس آئے جہاں وہ دونوں بزرگ مصروف تلاوت تھے بادشاہ نے ٹھیکری ان کے حوالے کر دی پڑھ کر انھوں نے تھوڑی دیر تامل کیا اور پھر بادشاہ سے یوں مخاطب ہوئے :۔

"قلعہ کا فتح ہونا مشکل ہے ....

بڑی بڑی ہستیاں سلطان ابوالحسن کی طرف دار ہیں۔"

بادشاہ نے دبی مگر بھری ہوئی آواز سے کہا :۔

"کیا میری مدد پر کوئی بزرگ ہستی نہیں ہے؟ کیا مجھ کو آپ دونوں کی ذات سے بھی یہ توقع نہ رکھنی چاہیے؟"

شہنشاہ اورنگ زیب جیسی بلند ہستی سے بحث مباحثہ میں جیت جانا آسان کام نہ تھا۔ انھوں نے ان بزرگوں کو مجبور کر دیا کہ ایک دفعہ اور کوشش کریں انھوں نے مجبور ہو کر پھر وہی ٹھیکری منگائی۔ بہت دیر تک سوچتے رہے اور رک رک کر اس پر کچھ لکھ دیا۔

رات ختم ہو رہی تھی، گولکنڈہ کے برجوں اور فصیلوں پر آخری شب کے چراغ ٹمٹما رہے تھے، مغل فوجوں کی چھاؤنیوں کی سمت سے صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے، اورنگ زیب

ٹھیکری لئے ہوئے دوبارہ لنگر حوض پر پہنچے۔ چمار دیر تک ٹھیکری کو گھورتا رہا۔ اس کی دماغی کشمکش ختم ہوتی نظر نہیں آرہی تھی۔ بادشاہ کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا، انھوں نے طویل انتظار کے بعد کہا۔

"صبح کی نماز کا وقت قریب آرہا ہے مجھے قبل طلوعِ آفتاب اپنے مورچوں میں واپس ہونا ہے آپ جلد کچھ کہئے۔"

چمار جذبہ سے لرزہ بر اندام تھا اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کے ہاتھ قابو میں نہ تھے ٹھیکری اس کے ہاتھ سے گر پڑتی تھی۔ اس نے اپنے جسم پر سے بکھرے ہوئے چمڑے اور پھٹے پرانے جوتے ہٹادئے۔ اور دامن جھٹک کر کھڑا ہوا۔ اس کی زبان سے نکلا:۔

"مشیت ایزدی یہی تھی۔ میں پچاس سال سے اس قلعہ کے دامن میں گوشہ نشین تھا۔ آخر جیتے جی یہاں سے اٹھنا پڑا۔ جاؤ ان سے کہدو کہ وہ چلا گیا۔"

اورنگ زیب جب اپنی فوج میں داخل ہوئے تو جگہ جگہ اذاں ہو رہی تھی انھوں نے ان بزرگوں کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ ان دونوں نے فتح کی مبارکباد دی اور کہا کہ:۔

"آج رات ہماری فوجیں قلعہ میں داخل ہو جائیں گی۔ اس کی حفاظت اور غیبی امداد کرنے والا وہاں سے اُٹھ گیا۔ وہ چمار نہ تھا بلکہ اس ملک کے قطب تھے اور پچاس سال سے اس سلطنت کے معاون و محافظ۔"

دوسرے دن رات میں مغل فوجیں قلعہ میں داخل ہوگئیں یہ اور بات ہے کہ تاریخ لکھنے والوں نے فتح کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ ایک غدّار سپہ سالار نے قلعہ کی ایک کھڑکی کھول دی تھی اس لئے مغلوں کو فتح نصیب ہوئی۔"

ان واقعات کو بوڑھے رسالدار نے اس دلکش اور موثر پیرائے میں بیان کیا کہ سننے والوں کو محسوس تک نہ ہو سکا کہ غروب آفتاب کا وقت قریب آچکا ہے اور ان کو اندھیرا ہونے سے قبل ہی نئے قلعے کے ویرانے سے باہر نکل جانا چاہئے۔

آخری سرفروش

۱

"اب ہماری باری ہے، چلو۔ دوڑو۔ یہ موقع ہاتھ سے جانے نہ پائے" حبشی محلہ میں ایک گڑبڑ مچی ہوئی ہے۔ ہر گھر سے حبشی عورتیں اور بچے بالاحصار کے صدر دروازے کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ عورتوں نے اپنے گھنگر والے بالوں کا چٹا بنا کر اُن پر اپنی اوڑھنیاں باندھ لیں اور دامنوں سے کمریں کس لی ہیں۔ بچے تیر و کمان ہاتھوں میں لئے ہوئے اپنی ماؤں سے ذرا آگے چل رہے ہیں۔ بعض عورتوں کی پیٹھ پر شیر خوار بچے بندھے ہوئے ہیں۔ سب فوجی گیت گاتی ہوئی دوڑ رہی ہیں۔ بعض اپنے بچوں کو سمجھا رہی ہیں کہ:۔

"بابو ڈر کر بھاگ نہ جانا بڑی آزمائش کا وقت ہے۔ اپنے مالک پر قربان ہونے کا یہی موقع ہے...... دیکھو اپنے ابّا کا ساتھ نہ چھوڑنا"

ایک بچہ ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ ماں ایک طمانچہ مار کر اٹھاتی اور ڈانٹتی ہے:۔

"ڈرپوک ابھی سے پریشان ہو گیا! اسی لئے تجھے پالا تھا؟"

۲

پانچسو حبشی مردوں اور عورتوں کا یہ ہجوم بالاحصار کے صدر دروازے پر پہنچ گیا۔ یہاں معمولی اوقات میں صرف پچاس حبشیوں کا پہرہ رہتا تھا اور ہر روز ان کی بدلی ہوتی اس طرح ایک دن نوکری اور پانچ دن چھٹی۔ لیکن جب سے قلعہ کا محاصرہ شروع ہوا تھا حبشی خود بخود دگنی تعداد میں اس دروازے پر موجود رہنے لگے تھے۔ اور آج صبح سے جو یہ خبر پھیل رہی تھی کہ مغل فوجیں قلعہ میں داخل ہو گئی ہیں، جملہ حبشی سپاہی اپنی نشست گاہ پر جمع ہو گئے بارہ بجے جب ان کے بچے حسب معمول کھانا لے آئے تو انھوں نے ان کو پیار کیا،

سر پر ہاتھ پھیرا۔ بعضوں نے اپنے جگر گوشوں کو گلے سے چمٹا لیا' اور ایک آدھ کی آنکھوں سے آنسو بھی ٹپک پڑے۔ ان معصوم بچوں اور ان کی بھولی بھالی ماؤں کو معاملہ کی نزاکت کا علم نہیں تھا۔ بادشاہ نے ان کے قیام کے لئے عین بالاحصار کے جنوبی دامن میں ایسی جگہ مکانات بنادئے تھے جو قلعہ کی شمال مشرق رویہ آبادی اور بازاروں سے بالکل علٰحدہ تھے۔ انھیں یہ علم نہیں ہونے پایا تھا کہ ان کا مہربان آقا ان سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہونے کو ہے۔ اور یہ کہ آج کی رات کے ساتھ گولکنڈہ کی زندگی بھی ختم ہونے والی ہے۔

بچے حیران تھے۔ ان کو اپنے اباؤں کی یہ مضطربانہ حرکتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ ان میں سے بعضوں نے ہمت کر کے پوچھ بھی لیا کہ :-

"ابّا! آقا تو سلامت ہیں نا؟ کیا دشمن ابھی قلعہ کے اطراف باقی ہیں؟ ہمیں گنبدوں اور بارہ دری کی سیر کو کب لے چلو گے؟ آقا نے تو ہم کو خاص طور پر اجازت دی تھی اور وہاں جاتے وقت پہننے کے لئے بھاری کپڑے بھی بھجوائے تھے۔ کتنے دن سے ہم ان کو نہیں پہن سکے؟"

بچوں کی ان معصوم باتوں نے بعض حبشیوں کو بہت متاثر کیا۔ وہ رونے لگے۔ انھوں نے کہا:-

"تم اپنی ماؤں سے ہمارا آخری سلام کہنا اور تاکید کرنا کہ اگر ہم واپس نہ آئیں تو کچھ فکر نہ کریں ہم کو کسی نہ کسی روز اپنے پیارے آقا کے کام آنا ہی تھا آخر ہماری زندگیاں کب تک بے مصرف گزرتیں؟ تم اپنے چھوٹے آقا شہزادہ خدا بندہ سے ویسی ہی محبت کرنا جیسا ہم اپنے آقا تاناشاہ سے کرتے ہیں"۔ جو بچے بڑی عمر کے اور ذرا سمجھ دار تھے وہ سمجھ گئے اور اپنی ماؤں کے یہاں دوڑے ان وفادار سپاہیوں کی جاں نثار بیویوں نے جب سنا کہ ہمارے آقا اپنے آقا پر سے قربان ہونے والے ہیں تو انھوں نے اپنے مکانوں کو خیرباد کہا۔ وہ جن کے لئے زندہ تھیں ان کے بغیر زندہ رہنا کیونکر گوارا کر سکتی تھیں۔ وہ بجلی کی طرح اپنے بچوں کے ساتھ شوہروں کے آخری دیدار اور ہو سکے تو اُن پر سے قربان ہونے کے لئے بے تابانہ دوڑیں۔

حبشی عورتیں اور بچے دروازے پر پہنچنے ہی پائے تھے کہ مغل فوج سامنے نمودار ہوئی۔ حبشی سردار نے اپنے سپاہیوں کو نشانہ باندھنے کا حکم دیا۔ چشم زدن میں مغل فوجوں کی صف اول کی قطار زمین بوس ہوگئی یہ بات مغل فاتحین کے ذہن میں نہ آسکی تھی کہ انھیں ابھی ایک اور مرحلہ طے کرنا ہے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ قلعہ کی سنگین فصیلوں کے فتح کرنے کے بعد اب کیا رکاوٹ حائل ہوسکتی ہے۔ وہ فتح کی خوشی میں گاتے بجاتے چلے آرہے تھے۔ انھیں کیا معلوم کہ پورے قلعہ پر مغلوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد بھی کوئی ایسا بے وقوف ہوگا جو فاتحین کی مزاحمت کریگا حبشیوں کو فاتحین اور مفتوحین سے کیا علاقہ۔ وہ تو اپنا فرض ادا کرنا چاہتے تھے۔ ان کا کام تھا کہ غیر شخص کو بادشاہ کی اجازت کے بغیر دروازے سے گزرنے نہ دیں۔ مغل فوج نے کوئی اجازت تو نہیں لی تھی اور نہ حبشیوں کو بادشاہ کے یہاں سے حکم ملا تھا کہ ان کو اندر آنے دیں۔ اس وقت انکے لئے یہی ایک صورت باقی تھی جس پر وہ عمل پیرا ہوگئے! جب پہلی صفیں گر گئیں تو مغل پیچھے ہٹے۔ ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور حبشی سردار کو آواز دی۔

"کیا تم ابھی خواب خرگوش میں ہو؟ سارے قلعہ پر ہمارا قبضہ ہو چکا ہے۔ ہم اب بالا حصار پر قبضہ کرنے آئے ہیں"۔

حبشی سردار نے جواب دیا "کیا تمھارے یہاں ہمارے ظل اللہ کا اجازت نامہ ہے کہ ہم تمھیں اندر آنے دیں؟"

مغل نے کہا۔ "تم لوگ ہوش میں بھی ہو یا نہیں؟ اب قلعہ پر حضرت اورنگ زیب بادشاہ غازی کی حکومت ہے"

حبشی نے بات کاٹ کر کہا۔ "خدانخواستہ! ہم جب تک زندہ ہیں یہ کیونکر ہوسکتا ہے۔"

مغل نے سمجھایا۔ "تم لوگ ملازم پیشہ ہو۔ ملازم کا کام ہے جو تنخواہ دے اسکی نوکری کرے۔ اب تمھارا بادشاہ ہماری قید میں ہوگا تم ہمکو راستہ دیدو ہم سفارش کرکے مغل فوج میں تمکو ملازمت دلادینگے۔"

"کیا کلمہ کفر بک رہا ہے!" ایک حبشی نے جھلا کر کہا اور فوراً اس مغل پر اپنی بندوق خالی کردی اب کیا تھا مغلوں اور حبشیوں میں معرکہ آرائی دست بدست شروع ہوگئی۔ ایک طرف مغلوں کے گھوڑے اور جرار سپاہی تھے۔ دوسری طرف پیدل حبشی اور ان کی غریب بیویاں اور معصوم بچے!!

جنھیں اپنی جان کی پروا نہیں ہوتی دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت انھیں بزدل نہیں بناسکتی۔ حبشیوں نے ایسا مقابلہ کیا کہ سیکڑوں مغل سپاہی تہ تیغ ہوگئے۔ اس غیر معمولی معرکہ کی خبر بالاحصار کے اندر تاناشاہ تک پہنچ گئی۔ انھوں نے حبشیوں کو کہلا بھیجا کہ :۔

"مغل میری رضامندی سے آرہے ہیں۔ تم مفت کیوں اپنی جانیں کھوتے ہو۔"

جب یہ خبر حبشیوں کو پہنچی تو پیام لانے والے کو انھوں نے ڈانٹا :۔

"غدّار کہیں کا! آقا نے ہرگز ایسا نہیں کہا۔ تم سب مغلوں سے مل گئے ہو جب تک بادشاہ خود بنفس نفیس ہمیں حکم نہ دیں گے ہمیں یقین نہ آئے گا۔"

یہ سن کر تاناشاہ حبشیوں کو سمجھانے کے لئے بالاحصار کے جھروکہ میں برآمد ہوئے مگر وقت گزر چکا تھا۔ وقت اور سیلاب کسی کے روکنے سے نہیں رکتا۔ جب انھوں نے دروازے پر نظر ڈالی تو تمام میدان سیاہ و سرخ رنگ کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ جاں نثاروں کے خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اور جگہ جگہ سیاہ فام بچوں اور عورتوں کے اعضا مچھلیوں کی طرح تڑپتے نظر آرہے تھے۔ بادشاہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔

اس قلندر صفت بادشاہ کی آنکھوں کے یہ سب سے پہلے اور سب سے آخری آنسو تھے۔

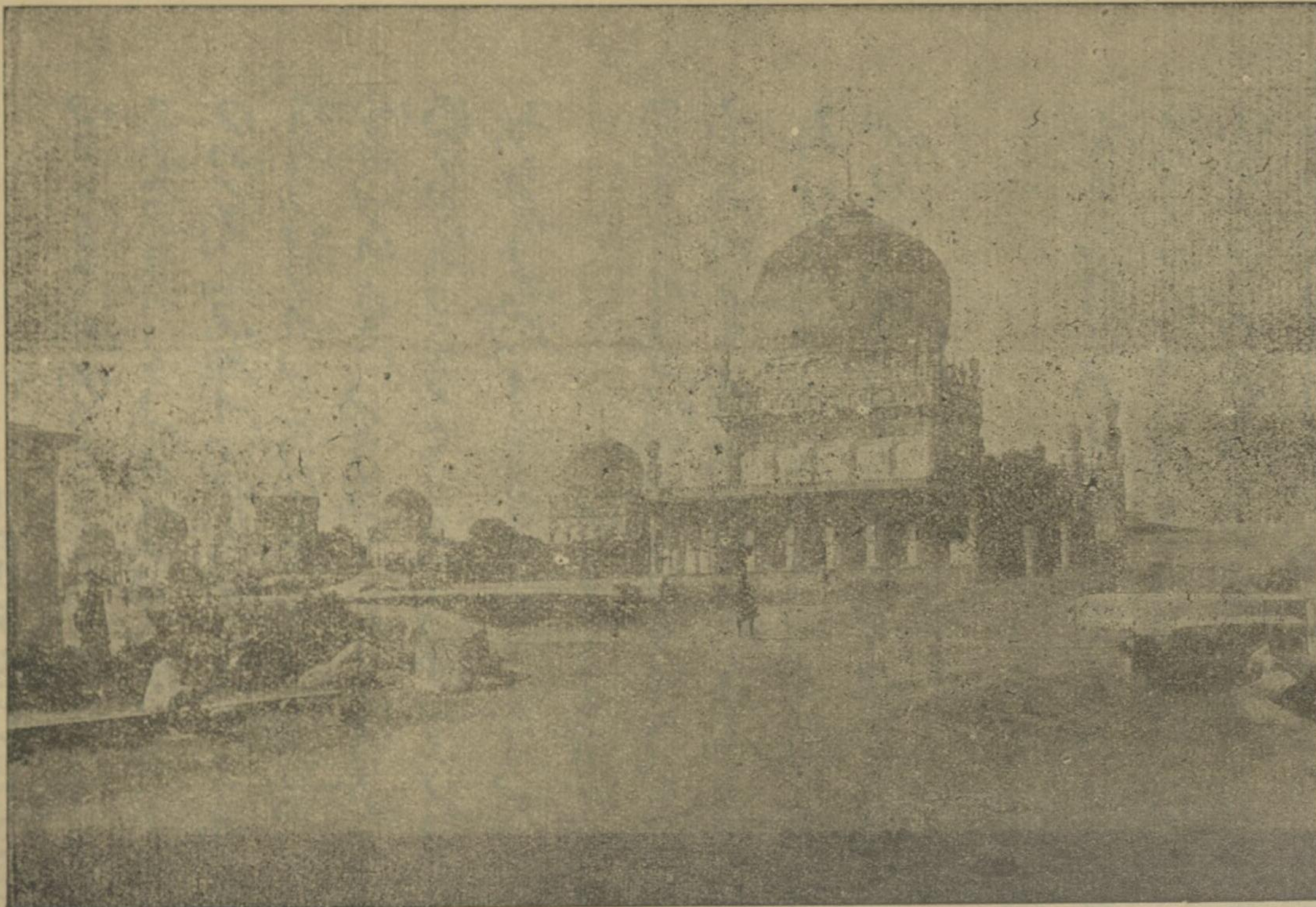
مغل سپاہیوں نے ان جاں نثاروں کی لاشوں سے اس کنویں کو بھر دیا جو دروازے کے سامنے تھا اور اس طرح بالاحصار تک پہنچنے کا راستہ نکال لیا۔

ان آخری سرفروشوں کی یاد اور ان کی خاک و خون میں آلودہ سسکتی ہوئی لاشوں کا آخری منظر تاناشاہ کی آنکھوں میں چودہ سال تک پھرتا رہا۔ انہی کی یاد میں وہ اپنے قیدخانے کی سختیوں اور مصیبتوں کو بھلایا کرتے تھے اور جب اُن کا وقت آخر آپہنچا تو انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی روح نہایت اطمینان اور آسانی سے نکل رہی ہے حالانکہ ان کے سرفروش حبشی جاں نثاروں نے ان کے لئے تڑپ تڑپ کر جان دی تھی۔

خاصے کا وقت

سلطان ابوالحسن قطب شاہ کے دربار میں مغل شاہزادہ اور وزیر اعظم کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ یہ شاہی دربار دنیا کی تاریخ میں ایک انوکھی حیثیت رکھتا ہے چشم زمانہ نے شاید ہی اس نوعیت کا کوئی دربار دیکھا ہو۔ پوری سلطنت پر دشمنوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ قطب شاہیوں کی رہی سہی امیدیں قلعہ گولکنڈہ سے وابستہ تھیں اس میں بھی آج صبح مغل فوجیں داخل ہوگئیں۔ دوپہر کے وقت سے کچھ قبل بالاحصار پر بھی تسلّط ہوگیا۔ اب صرف شاہی محلات اور دولت خانۂ عالی باقی رہ گئے ہیں۔ ان پر بھی کوئی دم میں مغلوں کا قبضہ ہونے والا ہے۔ گویا قطب شاہی سلطنت عالم نزع میں ہے اور جس طرح انسان مرنے کے قبل ایک سنبھالا لیتا ہے اور چراغ گل ہونے سے پہلے ایک آخری جھلک دکھا جاتا ہے بالکل اسی طرح اس عظیم الشان سلطنت کے خاتمے سے قبل اس کا یہ دربار اس کے دیرینہ جاہ وجلال کا آخری نمونہ پیش کر رہا ہے۔

فانی انسانوں کے صبر و استقلال کی آزمایش کا اس سے زیادہ کٹھن وقت اور کیا ہو سکتا ہے سب اہلِ دربار جانتے ہیں کہ تھوڑی دیر میں یہ بارونق محفل ہمیشہ کے لئے اجڑنے والی ہے اور اس کی تباہی کے بعد معلوم نہیں اس کے آراستہ کرنے والوں اور خود ان میں سے ہر ایک کا کیا حشر ہوگا خود بادشاہ سلامت سمجھ چکے ہیں کہ گولکنڈہ کے اس روح پرور ماحول، عالیشان ایوان، مخملیں فرش، رنگا رنگ پردوں، معمور خزانوں، سجے سجائے محلات، رشک فردوس بارہ دریوں، عمر بھر کے ساتھیوں، پرخلوص دوستوں اور وفاشعار خدمت گزاروں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونے کا وقت آگیا ہے۔ لیکن



سلاطین قطب شاہی کے گنبد

لیکن ان کے اور اہلِ دربار کے بُشرے یا کسی حرکت سے آنے والے انقلاب کا پتہ نہیں چلتا ایسا نظر آتا ہے کہ شاید یہ لوگ اپنے قریبی انجام سے ناواقف ہیں۔ ان کی فوق فطری ہمّت ان کا بلند پایہ وقار و تحمل اور ان کا شیوہ تسلیم و رضا دنیا میں ہمیشہ آفت زدہ اور غمدیدہ انسانوں کے لئے درسِ عبرت بنا رہے گا۔ تانا شاہ اور ان کے آخری رفیقوں نے اپنی اس امیری میں قلندری کی ایک ایسی مثال پیش کردی ہے کہ دنیا کی تاریخ شاید ہی اس کا جواب دکھا سکے۔

۲

دولت خانۂ عالی کی ہر چیز میں تزک و احتشام اور خاص ذوقِ شائستگی جھلک رہا تھا جو ہمیشہ شاہی مہمانوں کے ورود کے مواقع پر ظاہر ہوا کرتا تھا۔ بالا حصار کے دروازے سے ایوان خاص تک سُرخ مخملیں فرش بچھا ہوا تھا۔ نیلی نیلی وردیاں پہنے ہوئے چوبدار نقیب اور خدّام حسب معمول اپنی اپنی جگہ کھڑے تھے۔ امراء و مقربان خاص اپنی اپنی نشست پر دست بستہ حاضر تھے۔

جب مغل شاہزادہ اور امراء کی سواری دروازے پر پہنچی قطب شاہی امیروں نے سیڑھیوں تک بڑھ کر استقبال کیا۔ چوکی داروں اور بھالداروں نے شاہی سلامی دی۔ چوبداروں اور نقیبوں کی آداب آموز آوازیں بلند ہوئیں۔ تانا شاہ نے معمول کے مطابق ایوانِ خاص کی سیڑھیوں تک شہزادہ کا استقبال اور اس سے معانقہ کیا اور تخت گاہ تک لیجا کر اپنے ساتھ گولکنڈہ کے نیلگوں چترِ شاہی کے نیچے بٹھایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ قطب شاہیوں کے اس خاص شاہی چتر کے نیچے ایک دوسرے خاندان کا شہزادہ بیٹھ رہا تھا۔ جب تانا شاہ اور مغل شہزادہ دونوں بیٹھ چکے تو قاعدہ کے مطابق مزاج پرسی کی گئی آخر میں تانا شاہ نے کہا:۔

"آپ سب کو بڑی زحمت اٹھانی پڑی۔ دکن کی آب وہوا کو آپ نے کیسا پایا؟"

۳

شاہزادہ اور اس کے ساتھی مغل امراء وسپہ سالار اس دربار کی آراستگی و اطمینان پر حیران تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ بلکہ وہ یہ تک بھول گئے تھے کہ ہم یہاں اس بادشاہ کو قید کرنے آئے ہیں۔ لیکن اس عالم خود فراموشی کو شہنشاہ اورنگ زیب کے احکام کی یاد نے بہت جلد دور کر دیا۔ شہزادہ اصل موضوع کی طرف پلٹنے والا ہی تھا کہ باورچی خانۂ شاہی کا میر بخشی معمول کے مطابق زرق برق لباس پہنے ہوئے خادموں کے جلوس کے ساتھ نیچی نگاہیں کئے ہوئے دست بستہ تخت گاہ کی طرف بڑھا۔ اور عرض کیا "حضور بندگانِ اقدس خاصہ تیار ہے۔"

تاناشاہ نے شہزادہ اور وزیر اعظم کی طرف متبسمانہ نظر ڈالی اور کہا:۔

"اگر شہزادہ اور دیگر اصحاب بھی اس وقت میرے ساتھ خاصہ تناول فرمائیں تو موجب خوشنودی ہوگا۔"

مغل شہزادہ اور امراء ایک دوسرے کی صورتیں دیکھنے لگتے ہیں۔ انھیں کوئی جواب سجھائی نہیں دیتا۔ اس عالم سکوت کو دیکھ کر تاناشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا

"مجھے افسوس ہے کہ آپ صاحبین کو اس سے قبل اس کی زحمت دینے کا موقع نہیں ملا تھا اور نہ شاید اس وقت بھی آپ کے شایان شان انتظام ہوا ہے۔"

تاناشاہ جیسی شخصیت کی گفتگو اور کسی کو انکار کی جرأت ہو! سبھوں نے "بسرو چشم کہا"۔ نوجوان شہزادہ سے ضبط نہ ہوسکا اس نے آہستہ وزیر سے کہا:

"یہ خاصے کا کونسا وقت ہے۔"

بادشاہ نے شہزادہ کا جملہ سن لیا ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"میں اسی وقت کھاتا ہوں۔ میرے خاصے کا یہی وقت ہے۔"

۴

تاناشاہ اور ان کے معزز مہمان دربار سے اٹھ کر طعام گاہ کی طرف جا رہے تھے کہ بادشاہ کے ایک مقرب خاص نے جو باہر سے تیز تیز آرہا تھا سیڑھیوں کے قریب پہنچکر مودبانہ عرض کیا کہ :۔

"حضور سپہ سالار عبد الرزاق لاری بیہوشی کے عالم میں زخموں میں چوُر ایک درخت کے نیچے بے حس پڑے ہوئے نظر آئے اور انھیں نیم جان دیکھ کر بالا حصار میں لایا اور نگینہ باغ میں رکھا گیا ہے ابھی ابھی ہوش آیا تو انھوں نے بادشاہ سلامت کی خیر و عافیت دریافت کی اور کہا ہے کہ اس سے بہتر موت کیا ہوسکتی تھی کہ آقا کے قدموں کے قریب جان نکل رہی ہے۔"

بادشاہ نے اپنے مہمانوں سے کہا :۔

"اگر اجازت ہو تو اس جاں نثار کو ایک نظر دیکھ لیں!"

مہمانوں نے کہا۔ "ہم بھی اس بہادر کو دیکھنے کے مشتاق تھے۔ ناگوار خاطر نہ ہو تو ساتھ چلیں گے۔"

۵

جب تاناشاہ اپنے وفادار سپہ سالار کے قریب پہنچے تو اسکے زخموں سے مسخ شدہ چہرے اور حالتِ کرب و بے چینی سے بیحد متاثر ہوئے۔ انکی آواز سُن کر مجروح سپہ سالار نے اپنی پیشانی کا گوشت (جو آنکھوں پر لٹک رہا تھا) ہٹا کر بادشاہ کو دیکھا اور دبی آواز میں عرض کیا :۔

"خدائے تعالٰی حضور کی عمر و اقبال میں ترقی دے اور ہم جیسے سیکڑوں جاں نثار بندگانِ اقدس پر سے قربان ہو جائیں۔"

بادشاہ نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا:۔

"یار عزیز! تم نے آج شیوۂ وفا کی لاج رکھ لی، ورنہ جب عرصے سے تمھاری خبر نہ ملی تو شبہ ہو چلا تھا کہ شاید عبدالرزاق بھی میر جملہ کے مقلدوں میں شامل ہو گئے اور ہم سے بیوفائی کر کے غنیم سے جا ملے مگر اب ہم کو اس شکست سے جو کچھ اثر ہوا تھا وہ، یہ دیکھ کر زائل ہو گیا کہ کم از کم تم نے آخر وقت تک منہ نہ موڑا۔ اگر تمھاری طرح اور ایک شخص ہماری فوج میں ہوتا تو آج ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔"

عبدالرزاق کی زبان سے نکلا:۔

"سلطان ابوالحسن شاہ جیسی ہستی سے بے وفائی کرنا میرے نزدیک کفر ہے۔ میری دلی تمنا تھی کہ ظل اللہ پر سے اپنی جان قربان کر کے میں بھی حضرت امام مظلوم ابی عبداللہ الحسین علیہ السلام کے ساتھی بہتّر شہدا میں داخل ہو جاؤں اور خدا کا شکر ہے کہ یہ دیرینہ آرزو پوری ہو رہی ہے۔ میں کبھی کا ختم ہو جاتا اگر باہر پڑا رہتا۔ یہ صرف بالاحصار کی روح پرور فضا، نگینہ باغ کا جاں فزا ماحول اور قرب سلطانی کا اثر ہے جسکی وجہ سے اس تنِ بے جاں میں جان آئی اور بندگانِ عالی کی قدمبوسی کا ....." عبدالرزاق پر پھر سے بیہوشی طاری ہو گئی۔

بادشاہ نے اپنے مغل مہمانوں کی طرف پلٹ کر کہا:۔

"یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس وفادار سپہ سالار سے ہماری پہلی ملاقات بھی اسی باغ میں ہوئی تھی اور آج آخری ملاقات بھی یہیں ہو رہی ہے اس باغ میں ہم دونوں برسوں تک سلطنت کے انتظام اور مدافعت کے مشورے کرتے رہے ہیں۔ لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ ہمیں ایک دوسرے سے ہمیشہ کیلئے جُدا بھی ہوں گے۔"

یہ کہہ کر بادشاہ نے اپنے طبیبانِ خاص کو حکم دیا کہ فوراً علاج اور زخموں کی مرہم پٹی شروع کر دیں اور صدر طبیب کی طرف پلٹ کر مسکراتے ہوئے کہا:۔

"ایسی وفادار اور ممتاز ہستی کی خدمت ہر طبیب کو نصیب نہیں ہو سکتی"۔

بادشاہ طبیبوں کو ہدایتیں دے رہے تھے کہ عبدالرزاق لاری کے خون آلود جسم میں پھر حرکت پیدا ہوئی۔ نیم جاں سپہ سالار نے عرض کیا:۔

"حضور میرے لئے تشویش نہ کریں، مجھے بڑی ندامت ہے کہ خاصے کے وقت حضور کو زحمت کرنی پڑی۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ بندگانِ اقدس یہاں تک تشریف لائیں۔ میری صرف یہ خواہش تھی کہ حضور کو اس امر کا علم ہو جائے کہ میر جملہ اور عبداللہ خاں کی طرح عبدالرزاق احسان فراموش ثابت نہیں ہوا۔ حضور خاصے پر تشریف لے جائیں۔ مہمانوں کو بھی زحمت ہو رہی ہے"۔

تھوڑی دیر کے بعد جب بالاحصار پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا تو قلعہ گولکنڈہ کے مشہور آفاق ہیروں، بیش بہا جواہرات، نیلگوں شاہی علم، نادر اسلحہ اور دیگر عجوبۂ روزگار اشیاء کے ساتھ عبدالرزاق کو بھی ایک پالکی میں ڈال کر مغلِ اعظم کے خیمہ گاہ میں پہنچا یا گیا۔ شہنشاہ اورنگ زیب غازی نے بھی گولکنڈہ کے اس وفادار سپہ سالار کے علاج کے لئے اپنے شاہی اطبا کو خاص طور پر احکام صادر کئے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس فاتح سلطان کی زبان سے بھی وہی الفاظ نکلے جو تھوڑی دیر پیشتر مفتوح بادشاہ کی زبان سے نکلے تھے۔ اورنگ زیب نے کہا:۔

"اگر ابوالحسن قطب شاہ کے پاس عبدالرزاق جیسا اور ایک شخص ہوتا تو شاید ہی ہم گولکنڈہ فتح کر سکتے!!"

مٹی کی کلھیا

تانا شاہ بالاحصار کے صدر دروازے سے نکل رہے تھے۔ وہ اور مغل شہزادہ دونوں گھوڑوں پر سوار تھے ان کے بشرے، چال ڈھال اور گفتگو سے کوئی شخص اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اس وقت مغلوں کے قیدی ہیں اور اپنے وطن اور پایہ تخت سے ہمیشہ کے لئے علٰحدہ ہورہے ہیں۔ وہ اس بے پروا انداز میں اپنے محبوب گھوڑے پر سوار تھے گویا شکار کے لئے جارہے ہیں یا اپنے مہمان شہزادہ کو تھوڑی دور تک چھوڑ آنا چاہتے ہیں۔

سوار ہونے سے قبل بادشاہ نے اپنے امراء کا آخری سلام لیا۔ لیکن اسی معمولی انداز میں، بادشاہ کا رعب وداب ایسا تھا کہ امراء بھی اپنے جذبات ضبط کئے ہوئے تھے۔ جب تک بادشاہ ان کی طرف متوجہ رہے ان کی زبان سے اُف تک نہ نکلا۔ لیکن انکے متغیر چہرے بتا رہے تھے کہ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک متلاطم سمندر پوشیدہ ہے۔ اتفاق کی بات تھی یا نہ معلوم جان بوجھ کر بادشاہ نے فصیلوں کے اوپر محل کے جھروکوں کی طرف نظر نہیں اٹھائی ورنہ وہ محل کی پردہ نشینوں کو پریشان حال دیکھ کر ضرور متاثر ہوتے۔ وہ سب دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھی ہوئی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ یہ روز بد دیکھنا نصیب ہو مگر سچ ہے ع جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔

آج قطب شاہی محلات کی پردہ نشین ماہ وشیں بالکل مجبور بھی نہیں تھیں۔ انھوں نے اپنی قسمت کا آپ ہی فیصلہ کرلیا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی قوت اُن کی قسمت کا فیصلہ کرے۔ آج پہلی دفعہ وہ محسوس کر رہی تھیں کہ وہ مختار ہیں۔ اور ناحق اب تک اپنے پر مجبوری کی تہمت لگا رہی تھیں۔ جب بادشاہ کا گھوڑا نظروں سے اوجھل ہوگیا اور

دُنیا ان کے لئے تیرہ و تار ہو گئی تو انھوں نے اپنے فلک شگاف نالوں اور آہ و شیون سے بالاحصار اور محلات شاہی کو سر پر اٹھا لینا چاہا۔ لیکن انھوں نے سوچا کہ دم کے دم میں مغل سپاہی محل کے اندر گھس آئیں گے اور پھر نہ معلوم ہمارا کیا حشر ہو۔ انھوں نے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور ایک ساتھ اس عظیم الشان حوض نما باؤلی میں گرنے لگیں جو ان ہی جھروکوں کے پیچھے محل کے صحن میں اب تک موجود ہے۔

دوسرے روز علی الصباح مغل سپاہی خزانوں کی تلاش میں اس باؤلی کی طرف بھی پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ سیکڑوں عورتوں کی لاشیں پانی میں غرق ہیں جن میں بیسیوں نہایت نوعمر اور مہ جبیں ہیں۔

۲

قلعہ کے دروازے سے نکلتے ہوئے تانا شاہ نے شہزادہ سے مسکرا کر کہا۔

"حیدرآباد کے اطراف واکناف کی پہاڑیوں کا منظر کیسا خوشنما معلوم ہوتا ہے! آپ نے کبھی ان کی سیر کی ہے؟"

اس وقت تک ان دونوں میں کافی خلا ملا پیدا ہو چکا تھا۔ شہزادہ نے جواب دیا۔

"اس کا بالکل موقع نہیں ملا۔ ہم برابر جنگ میں مشغول رہے۔ آپ کی فوجوں اور موسیٰ ندی کی طغیانیوں نے ہمیں رات دن مشکلات میں گھیرے رکھا۔ مجھے تو آپکی طبیعت پر حیرت ہوتی ہے۔ کیا اس واقعہ کا آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا؟"

"اثر تو ہر انسان کو ہونا چاہیئے۔" تانا شاہ نے سنجیدہ انداز میں کہا "لیکن اثر اثر میں فرق ہے۔ مجھے سلطنت اور حکومت کوئی ایسی عزیز نہیں تھی۔ شاید آپ جانتے ہوں گے کہ میں نے بادشاہت سے قبل چودہ سال تک قلندری کی ہے اور اپنے مرشد کی

خدمت میں فقر و فاقہ کی جملہ منزلیں طے کرلی ہیں اس کے بعد یکایک مجھے شاہی محل میں پہنچا دیا گیا۔ میں اس وقت بھی مجبور تھا۔ مرشد کے حکم کی تعمیل لازمی تھی۔ اب میں شاہی محل سے نکالا جا رہا ہوں اس وقت بھی مجبور ہوں۔ اس عالم مجبوری میں شکوہ و شکایت اور رنج و الم کا کیا موقع؟ ہم نے مقدور بھر کوشش کرلی کہ قطب شاہیوں کی یہ امانت قطب شاہی نسل میں واپس کردیں مگر اس میں ناکامی ہوئی اور اگر اثر ہے تو اسی کا!! دُنیا والے خیال کریں گے کہ جب تک بادشاہوں میں قطب شاہی خون رہا سلطنت بچی رہی اور جہاں ایک غیر شخص کے سپرد کی گئی اس کو زوال آگیا۔ گویا ہم اس امانت کا بار نہیں اٹھا سکے۔ اگر ہم یہ امانت اپنے لڑکے شہزادہ خدابندہ تک پہنچا دیتے جس کی رگ رگ میں قطب شاہی خون دوڑ رہا ہے، تو ہم اپنے اس فرض سے سبکدوش ہو جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے آپ کی فوجوں کا مستعدی سے مقابلہ کیا اور آپ کو عرصے تک زحمتیں اٹھانی پڑیں۔ اگر اس ذمہ داری کا خیال نہ ہوتا تو پہلے ہی روز قلعے کے دروازے کھول دئے جاتے اور خلق اللہ کا اتنا خون بہنے نہ پاتا۔ انسان ان ہی امانتوں کی وجہ سے اتنا پریشان ہے اور یہی امانتیں تو ہیں جن کی بنا پر وہ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے، اور شاید دنیا کا بادشاہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔"

۳

مغل شاہزادہ پر تاناشاہ کی قلندرانہ طبیعت اور بے باکانہ گفتگو کا بڑا اثر پڑا۔ اس نے شہنشاہ اورنگ زیب کی بارگاہ میں تاناشاہ کی بڑی تعریف کی۔ یہی وجہ تھی کہ اورنگ زیب نے تاناشاہ کو گوالیار کے قلعہ میں روانہ نہیں کیا جہاں تمام شہزادے اور بادشاہ قید کئے جاتے تھے اور جہاں چند ماہ قبل ہی بیجاپور کا بدنصیب بادشاہ سکندر عادل شاہ بھی نظر بند کر دیا گیا تھا۔

اِدہر مغل فوجیں گولکنڈہ اور حیدرآباد کو تاخت و تاراج کرنے اور شاہی خزانوں اور دفینوں کی تلاش میں مصروف ہوئیں اور ادہر خانماں برباد تاناشاہ اور ان کا فرزند یعنی دودمانِ قطب شاہیہ کا آخری چشم و چراغ خداؔبندہ (جس کو اورنگ زیب نے بندۂ سلطان کا خطاب عطا کیا تھا) اپنے آخری قید خانۂ دولت آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ تاناشاہ تو گولکنڈہ کو بھی قید خانہ ہی سمجھتے تھے۔ آزادوں کو حکمرانی اور سلطنت کی بندشوں سے کیا واسطہ؟

یہ بھی عجیب وقت تھا۔ کم عمر شہزادہ اپنے پڑنانا سلطان محمد قلی قطب شاہ کی بسائی ہوئی بستی سے ایک قیدی بن کر نکل رہا ہے۔ جس سرزمین میں اس کا خاندان سیکڑوں برس سے حکمراں تھا آج اس میں اس کو سر چھپانے تک کی جگہ نہیں۔ اپنے بزرگوں کی بنائی ہوئی عالی شان عمارتوں مثلاً چارمینار، بادشاہی عاشور خانہ، دادمحل، دولت خانۂ عالی، چارمحل، خداداد محل پر وہ حسرت سے نظر ڈال رہا ہے۔ اس کو نہیں معلوم کہ ان میں سے اکثر شاہی عمارتیں صرف چند روز کی مہمان ہیں اور بہت جلد فاتحین کا دستِ تعدّی ان کو کھنڈروں کی شکل میں منتقل کر دے گا۔ یہ وہ عمارتیں تھیں جن کی تعمیر میں اس سرزمین کے کروڑوں روپیے صرف ہوئے تھے اور جن کو لاکھوں صنّاعوں نے سالہا سال میں بادشاہوں کے شایانِ شان بنایا تھا۔ یہ دکنی تمدن، شاہانہ عظمت اور فنِ تعمیر کے وہ بیش بہا خزانے تھے جن کی تباہی نے اس ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔

۴

شہزادہ اپنے ستم زدہ باپ کے روبرو ہاتھ باندھے مودب بیٹھا تھا۔ جیسے

اِن قیدیوں کا میانہ آگے کو بڑھتا جاتا تھا حیدرآباد کے گلی کوچے اور محلات ان کی نظروں کے سامنے آتے جا رہے تھے۔ جب شہر سے نکل کر حسین ساگر کے تالاب پر پہنچے اور کٹہ پر سے گزرنے لگے تو شہزادہ کو تالاب کا پانی دیکھ کر پیاس معلوم ہونے لگی۔ اُس نے باپ سے اس کا ذکر کیا۔ تاناشاہ کو اپنی عمر میں پہلی دفعہ ایسی پریشانی لاحق ہوئی۔ اس کے ساتھ آب خاصہ کے ملازم اور خدمتگار رہتے تھے۔ شہزادہ نے چاندی سونے کے برتنوں کے سوا کسی اور برتن میں پیا ہی نہ تھا۔

جیسے جیسے حسین ساگر کے کٹے پر بڑھتے جا رہے تھے تالاب سامنے آرہا تھا یہاں تک کہ شہزادہ کو پانی ہی پانی نظر آنے لگا اور اس منظر نے اس کی پیاس میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ اس نے پھر اپنے باپ سے اپنی تشنگی کا اظہار کیا تاناشاہ نے میانے سے باہر نظر ڈالی۔ ذرا جھک کر دیکھا تو آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف ننگی تلواریں لئے ہوئے سپاہی ہی سپاہی نظر آئے۔ بادشاہ اسی طرح باہر کی طرف دیکھ رہے تھے کہ ان کو دور ایک سقہ نظر آیا جو فوجوں کے گذرتے وقت گرد و غبار کو روکنے کے لئے سڑک پر پانی چھڑکا کرتا تھا۔ بادشاہ نے قریب کے سوار کو اشارہ کیا کہ سقہ کو بلائے۔ مغل سپاہی کئی ماہ کے محاصرہ کے دوران میں تاناشاہ کی قلندر منشی، بلند حوصلگی اور غریب پروری سے واقف ہو چکے تھے۔ اور اس کے اتنے گرویدہ ہو گئے تھے کہ ان میں سے اکثروں کو آرزو تھی کہ اس بے نیاز ہستی کی کوئی خدمت بجالائیں۔

۵

غریب سقہ پریشان تھا کہ اس کے یہاں پانی پلانے کے لئے میانہ نشینوں کے شایانِ شان کوئی برتن نہیں ہے۔ بادشاہ نے اس مٹی کی کلھیا کی طرف اشارہ کیا جو اس کے بائیں ہاتھ میں تھی اور جس سے وہ غالبًا سپاہیوں کو پانی پلاتا تھا۔ سقہ نے

اس مٹی کی کلھیا کو پانی سے بھر کر میانے میں بڑھا دیا۔

جب شہزادہ نے پانی پی کر سقہ کو کلھیا واپس کی تو تاناشاہ نے اپنی انگلی سے انگوٹھی نکال کر اس مٹی کی کلھیا میں ڈال دی۔ یہ آخری دولت تھی جو اتفاقاً آخری قطب شاہی تاجدار کے ساتھ گولکنڈے سے جا رہی تھی۔ اس کو دیدینے کے بعد تاناشاہ کے پاس گولکنڈہ اور حیدرآباد کے مشہور آفاق خزانوں کا ایک حبہ بھی نہیں رہا۔

غریب سقہ مٹی کی کلھیا میں روشنی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ تمام فوج میں یہ خبر مشہور ہو گئی۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے جاسوس ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ انھوں نے شہنشاہ کو بھی اطلاع کی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سقہ کے لئے دو سو روپیے روانہ کئے اور کئی ہزار کے ہیرے کی وہ انگوٹھی منگوالی۔

بالا

باؔلا گولکنڈہ کی وہ بدقسمت مہ جبین تھی جس کے حسن وجمال اور رعنائیوں کا چرچا اس وقت شروع ہوا جب قطب شاہی سلطنت کا نیر اقبال غروب ہونے کو تھا۔ اس کی اٹھتی جوانی اس کی گلنار آنکھیں، اُس کے سڈول بدن کی اٹھان، اُس کا کندنی رنگ، اُس کی رسیلی آواز اور اس کی ہر ایک مستانہ ادا ظاہر کرتی تھی کہ وہ بھاگ متی اور تارامتی کی جانشین اسچی جانشین ہے۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ حیدر آباد کی آخری عظیم الشّان مغنیہ تھی اور اگر اس کے عین عنفوان شباب کے زمانہ میں قطب شاہی سلطنت کا چراغ گل نہ ہو جاتا تو باؔلا بھی "بھاگ وان" ثابت ہوتی، اس کا نام بھی حیدر آباد کی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہو جاتا، اور رقص و سرود کے آسمان پر ایک اور ستارہ کا اضافہ ہوتا۔

وہ بارہ سال کی تھی جب پہلی دفعہ شاہی محل میں لائی گئی اور اس کے رقص و سرود نے خداداد محل کو گرما دیا۔ اِس قدر دان ماحول میں کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اپنے حسنِ خداداد اور کمال فن کی داد حاصل نہ کرتی۔ ملکہ نے پہلے ہی مجرے میں زر و جواہر سے بھری ہوئی دو کشتیاں انعام میں عطا کیں اور باؔلا کو عمر بھر کے لئے مالا مال کر دیا۔ اسی طرح جب کبھی وہ محل میں آتی توقع سے زیادہ انعام و اکرام حاصِل کرتی۔ حالانکہ ابھی بادشاہ کو اپنے کمالات سے محفوظ کرنے کی اسے عزّت

حاصل ہوئی تھی اور نہ شاہی داد و دہش سے سرفراز ہونے کا موقع ملا تھا۔

وہ اصل میں مادنّا دیوان کے بھتیجے کے لئے زیور رقص و سرود سے سنواری جارہی تھی اور دیوان ہی کے حکم سے ملکہ کی سالگرہ کے موقع پر دیوان کی طرف سے نغمۂ مبارک باد سنانے کے لئے محل میں روانہ کی گئی تھی۔

محاصرہ گولکنڈہ کے زمانہ میں جب دیوان مادنّا کو شر انگیزوں نے قتل کردیا تو اس کے دوسرے وابستگان کی طرح یہ نازنین بھی گوشہ نشینی اختیار کرنے کے خیال سے گولکنڈہ کے خفیہ راستہ سے نکلی۔ اس کا وطن ایک چھوٹا سا گانوں تھا جو ستم دیدہ دیوان کی جاگیر میں واقع تھا۔ اتفاق سے شہزادہ معظم کے فوجیوں نے اس خانماں برباد قافلہ کو دیکھ لیا اور شہزادہ کے یہاں پکڑ لائے۔ اس عالمِ سراسیمگی میں بھی اس قافلہ کے ساتھ اتنا زر و جواہر تھا کہ اس کو دیکھ کر شہزادہ معظم حیران رہ گیا۔ مگر وہ اس سیم و زر سے زیادہ باؔلا کے دلکش خد و خال اور حسن و جمال پر متحیر تھا۔ اس کے شائستہ لباس اور پاکیزہ ذوق آرائش کو دیکھ کر اس نے بیک نظر خیال کیا کہ شاید یہ کوئی شہزادی ہے مگر اس کی پیشانی کا ٹیکہ اس کے ہندو ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔ میدان جنگ کی مصروفیت نے موقع نہ دیا کہ وہ اس قافلے اور اُس کے پری جمال قافلہ سالار کے متعلق زیادہ پوچھ گچھ کرسکتا۔ رات میں جب فرصت ملی تو اپنے ملازم خاص کے ذریعہ سے باؔلا کو اپنے خیمہ میں بلا بھیجا اور ایسے التفات سے پیش آیا کہ بے خبر باؔلا سارا واقعہ بلا کم و کاست بیان کردینے پر مجبور ہوگئی۔

شہزادہ نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا کہ :۔

"ہم تم کو دلّی لے جانا چاہتے ہیں اور توقع ہے کہ تم بھی ہمارے

دل کی ملکہ بنی رہو گی۔"

بالا دل ہی دل میں متردد تھی کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ وہ حواس باختہ ہو گئی اور کچھ بگڑ کر کچھ سنبھل کر یوں گویا ہوئی:۔

"آپ ہمارے بادشاہ کے دشمن ہیں۔ آپ کی فوجوں نے ہمارے ملک کو ویران اور ہمارے گھروں کو بے چراغ کر دیا ہے۔ آپ نے اتنے عرصہ سے دکن کے کوہستانوں کو میدانِ رستخیز بنا رکھا ہے پھر بھی آپ کو معلوم نہیں کہ جو شخص ایک دفعہ بھی تاناشاہ بادشاہ کا نمک کھا لیتا ہے تو وہ پھر کسی اور کی غلامی پسند نہیں کرتا۔"

شہزادہ سٹپٹا گیا اور متعجب ہو کر پوچھا:۔

"کیا تم نہیں جانتیں کہ تمھارا آقا مادنّا دیوان تاناشاہ ہی کے اشارہ سے قتل ہوا ہے پھر بھی تعجب ہے کہ تم اس کے نمک کا پاس کرنا چاہتی ہو۔"

بالا نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا:۔

"صاحب عالم ایسا ارشاد نہ فرمائیں آپ ہمارے بادشاہ پر اتنا بڑا الزام نہیں لگا سکتے۔ گولکنڈہ یا حیدر آباد میں کوئی انسان آپ کو ایسا نہ ملے گا جو اس ہر دلعزیز بادشاہ کے خلاف اس طرح کا ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے۔ اور اگر واقعی تاناشاہ نے میرے آقا کے قتل کا حکم دیا ہے تو کیا تعجب کہ میرا آقا اس سزا کا مستحق ہو۔ ہم تو ہمیشہ یہی سمجھتے رہیں گے کہ ہمارے

آقا نے اپنے آقا کی راہ میں جان دیدی۔ اور ہم میں سے ہر شخص ہر وقت یہی کرنے کے لئے تیار ہے"۔

شہزادہ بالاؔ کی اس بے باکانہ گفتگو پر حیران تھا۔ اس کے ذہن میں نہ آسکتا تھا کہ ایک طوائف کی تربیت اور ذہنی نشو و نما ایسی اعلیٰ پایہ ہو سکتی ہے۔ وہ بھاگ متی اور پیمامتی کے حُسن و جمال کی شہرت اور اُن کے رقص و سرود کے کمالات کے قصے سن چکا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ گولکنڈہ کے شاہی طوائف کا ذہنی ارتقا اور معیارِ زندگی اس قدر بلند ہوتا ہے۔ اس نے اب ایک دوسرے طریقہ سے اِس مہ جبین کو پھانسنا چاہا۔ اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا کہ:۔

"تم مغلوں کی اصلی شان و شوکت سے واقف نہیں ہو۔ گولکنڈہ والوں نے ہم کو اپنے اصلی رنگ میں نہیں دیکھا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ شہنشاہ کی مسلسل معرکہ آرائیوں اور خونریزیوں کی وجہ سے تمھیں ہماری صرف جنگجوئی کی قوتوں کو آزمانے کا موقع ملا ہے۔ تم لوگ نہیں جانتے کہ ہم شبستان محبت میں حریر و پرنیاں سے زیادہ نرم بن جاتے ہیں"۔

پھر ذرا نرم ہو کر یوں گویا ہوا:۔

"بالا تم اپنے دل سے ہر قسم کا خطرہ دور کر دو۔ اور خوش خوش میرے ساتھ چلو۔ دلی دیکھ کر تم گولکنڈہ کو بالکل بھول جاوگی۔ گولکنڈہ اب تم جیسی پری جمالوں کی قدر نہ کر سکے گا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ تم شاہوں اور شاہنشاہوں کے دربار کے لائق ہو۔ تمھارا نام بھی بالا ہے اور شاید یہ مصرعہ تمھارے ہی لئے

کہا گیا تھا کہ ع نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔

مادنّا تو مارا ہی جا چکا ہے۔ نہ معلوم اس کے بھتیجے کا کیا حشر ہوا ہے تم اس ذلیل ہستی کے خیال میں........"

شہزادہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ سرمست شباب بالا کا جذبۂ خودداری شعلہ کی طرح بھڑک اٹھا اس نے جھلّا کر کہا کہ:—

"آپ ایسا نہ فرمائیے۔ مغل ایک طوائف کی کیا قدر کر سکتے ہیں جب انھوں نے ایک بلند مرتبت شہزادی کی کچھ قدر نہ کی۔ میری ملکہ کی سگی بہن سلطان عبداللہ کی منجھلی شہزادی آپ ہی کے بھائی سے بیاہی جا چکی تھی۔ جس گھڑی وہ نیک بخت شہزادی اس قلعہ کے دروازہ سے باہر نکلی اسی وقت سے خیر و برکت اور امن و عافیت نے بھی ہمارے پیارے قلعہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔"

مغل شہزادہ سراسیمہ تھا۔ وہ پہلے ہی باؔلا کے حسن و جمال کے رعب میں اپنا شاہی وقار کھو بیٹھا تھا۔ گولکنڈہ کی اس نوخیز مطربہ کی شوخ و شنگ آنکھوں نے اس پر پہلے ہی جادو کا سا اثر کیا تھا۔ اب جو اِس بلا نے کڑک کر گفتگو شروع کی تو اس کو اپنے والد شہنشاہ اورنگ زیب کے جاسوسوں کے خوف نے لرزہ براندام کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ شہنشاہی جاسوس اُس کی ہر نقل و حرکت پہ نظر رکھتے ہیں کیونکہ شہنشاہ کو شبہ ہو گیا تھا کہ وہ تاناشاہ سے مل گیا ہے۔ اس نے دبی زبان سے کہا:—

"بالا تمھاری گفتگو نے مجھے اور زیادہ تم پر مائل کر دیا ہے۔ میں آج رات اس خیال کی صداقت کا قائل ہو گیا کہ ع



بالا ـــ آخری قطب شاہی رقاصہ

بسا کیں دولت از گفتار خیزد۔ میں تم کو ایک رات کی مہلت دیتا ہوں اگر کل اس وقت تک تم بخوشی راضی نہ ہو جاؤ گی تو ہم مجبور ہو جائیں گے کہ قیدیوں کی طرح دلی کی طرف روانہ کردیں۔"

مصیبت زدہ بالا رات بھر سر بگریباں رہی۔ صبح ہوتے ہی شہزادہ نے اپنے ملازم خاص کے ذریعہ سے مطلع کر دیا کہ :۔

"سب قیدی دلی کو روانہ کر دئے جائیں گے اگر بالا بخوشی اپنے آپ کو شہزادہ کے سپرد نہ کردے۔"

بالا نے جواب میں کہلا بھیجا کہ :۔

"اگر صاحب عالم کا ایسا ہی منشا ہے اور وہ اسی طرح جبر و تعدی پر اتر آئے ہیں تو ہمیں بھی کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

جیسا جیسا دن چڑھتا گیا مغل فوجوں کی مصروفیت بڑھتی گئی۔ آج سرنگ کے ذریعہ سے قلعہ کی فصیل مسمار ہونے والی تھی اور مغل فوج کی ایک بڑی جماعت اسی سمت جمع ہو گئی تھی جہاں سے فصیل میں رخنہ پڑنے والا تھا تاکہ راستہ ملتے ہی قلعہ پر فوراً حملہ کر دیا جائے۔ سرنگ کی بتی کو آگ لگانے کا وقت گذر چکا تھا۔ سب سر اٹھائے ہوئے فصیل کی طرف دیکھ رہے تھے اور منتظر تھے کہ اب سرنگ اڑے گی اور حملہ کا آغاز ہوگا۔ اتنے میں ایک بڑے دھماکہ کے ساتھ خود مغل فوج کے نیچے کی زمین شق ہوئی اور سیکڑوں سپاہی اور گھوڑے اور ہتھیار گرد و غبار کے ساتھ ہوا میں اڑتے ہوئے نظر آئے۔

اہل گولکنڈہ کو مغلوں کی سرنگوں کا پتہ چل گیا تھا اور انھوں نے پہلے ہی سے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ چاہ کن را چاہ درپیش کی مثل صادق آجائے۔

چنانچہ سیکڑوں مغل سپاہیوں کے علاوہ متعدد بڑے بڑے افسر اور سرداران فوج بھی یا تو سرنگوں میں زندہ در ہو گئے یا سخت زخمی ہوئے۔ شہزادہ معظم اور اس کے ساتھیوں کو اِن آفت زدوں کی دستگیری میں ہمہ تن مصروف رہنا پڑا اور اسکے خیموں اور نو گرفتار شدہ قیدیوں کی کافی نگرانی نہ ہو سکی۔ بالاؔ نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر خیمہ کے پاسبان کو ایک ہیرے کی انگوٹھی دکھاتے ہوئے کہا:-

"اگر تم شہنشاہ اورنگ زیب تک ہماری اس حالت زار اور
ہمارے مال و متاع کے لوٹ کھسوٹ کی خبر پہنچادو تو یہ
بیش بہا انگوٹھی تمھاری نذر ہے"۔

پاسبان سپاہی نے پہلے تو صاف انکار کر دیا۔ لیکن بالا اور اُس کے ساتھیوں کی منت سماجت اور ترغیب و تحریص سے آخر کار رضامند ہو گیا۔ اور اپنی جگہ ایک دوسرے سپاہی کو متعین کر کے شہنشاہ کے جاسوسوں تک یہ خبر پہنچادی۔

شہزادہ معظم تمام دن کی پریشانیوں سے تھکا ماندہ اپنے خیمہ میں واپس ہوا تھا اور ابھی بالا کا خیال بھی نہ کرنے پایا تھا کہ شہنشاہی حکم آپہنچا اور شہزادہ کو مجبوراً قیدیوں کے علاوہ ان سے حاصل کیا ہوا تمام زر و جواہر بھی بارگاہ سلطانی میں روانہ کر دینا پڑا۔ بالاؔ نے چلتے چلتے اس مغل سپاہی کو اِدھر اُدھر دیکھا تاکہ اس کا موعودہ انعام یعنے گراں بہا ہیرے کی انگوٹھی اس کو عطا کر دی جائے مگر اس کا پتہ نہ چلا۔ وہ بے چارہ آفت کا مارا شہنشاہ کے جاسوسوں کے پاس مخبری کر کے ہیرے کی انگوٹھی کی توقع میں واپس ہو رہا تھا کہ خود شہزادہ کے جاسوسوں نے اس کو گرفتار کر لیا۔

جب دوسرے روز صبح میں شہزادہ نے معلوم کیا کہ بالا کس ہوشیاری سے

اس کے قبضہ سے نکل گئی ہے تو بے حد خشمناک ہوا اور اپنے جاسوسوں کے ذریعہ سے اس کے یہاں کہلا بھیجا کہ :-

"یاد رہے ایک روز اس فریب کا ضرور بدلہ لیا جائے گا"۔

اورنگ زیب نے اِن قیدیوں کو دو چار روز تک ٹھہرائے رکھا اور کوشش کی کہ قلعہ کے حالات معلوم کرنے میں ان سے مدد لی جائے مگر جب دیکھ لیا کہ یہ لوگ اِس کے کسی کام کے نہیں ہیں تو ایک رات ان کو لشکر سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ بالا اور اس کے ساتھی رات کی تاریکی میں کچھ اس طرح غائب ہو گئے کہ شہزادہ معظم کے جاسوسوں کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائی۔

۲

اس واقعہ کو ایک عرصہ گذر چکا۔ اس اثنا میں گولکنڈہ کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی شہزادہ معظم اور شہنشاہ اورنگ زیب ایک عرصہ قبل اس رشک فردوس کوہستان کو ایک وحشت خیز خرابہ کی شکل میں چھوڑ گئے تھے۔ اورنگ زیب کا چہیتا شہزادہ کام بخش حیدر آباد کے مشہور آفاق خداداد محل کے ایک عقبی دالان میں ٹہل رہا تھا۔ اس کو مستقبل کی فکر دامنگیر تھی۔ اس عظیم الشان محل کا گوشہ گوشہ اپنی عظمت گذشتہ پر نوحہ خوانی کرتا نظر آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک نئی نویلی اور آراستہ و پیراستہ دلہن یکایک بیوہ ہو گئی ہے اور اس کا تمام سنگھار اس کے سہاگ کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔ لیکن اس تباہی کے باوجود اس کے نوعروسی کے آثار باقی ہیں۔

کام بخش کے مضطرب دل کو اس ستم زدہ ماحول اور اجڑے دیار کا چپہ چپہ ہر گھڑی ایک نئی ٹھیس لگاتا تھا۔ جب کبھی کسی دروازہ یا کھڑکی کے اکھڑے ہوئے

زرین یا ہاتھی دانت کے نقش ونگار چھتوں، محرابوں، اور دیواروں کے طلا کار حاشیوں کے باقی ماندہ آثار پر اس کی نظر پڑتی تو اُس کی وحشت میں اور اضافہ ہو جاتا۔ وہ کبھی اپنے فتحمند باپ کی ظالم فوجوں اور اس کے متعین کردہ صوبہ داروں کی ان تباکاریوں پر افسوس کرتا اور کبھی قطب شاہی حکمرانوں کے ذوق لطیف اور سلیقہ زندگی کی بے تحاشا تعریف اس کے منہ سے نکل پڑتی۔

اس ویران شہر کی رونق اور تباہ و برباد ملک کی آسودہ حالی کے لئے وہ اس وجہ سے فکرمند تھا کہ اس کو وہ اپنا پایہ تخت بنا کر اپنے باپ کی زندگی ہی میں اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا چاہتا تھا مگر بار بار اس کو یہی خیال ستاتا تھا کہ مغل فوجوں نے اس کو اس بری طرح تباہ کیا ہے کہ اس کا اب عرصۂ دراز تک اصلی حالت پر پہنچنا مشکل ہے۔ اس کی دولت و ثروت پوری طرح غارت ہو چکی ہے اور برسوں یہ شہر لٹتا رہا ہے۔ تاہم کام بخش کو توقع تھی کہ اس خرابہ میں بھی کوشش سے اتنی دولت مل سکے گی کہ اس کے ذریعہ سے وہ اپنے کو اپنے بھائیوں کے مقابلہ میں مستحکم کر سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اہلِ حیدرآباد کو شہر میں لاکر بسانے کے لئے دور دور تک اپنے جاسوس پھیلادئے تھے اور جو کوئی خوشی سے نہ آتا اس کو مجبور کر کے قیدیوں کی طرح شہر میں لایا جاتا تھا۔ اور ہر ایک کو لالچ دے کر یا ڈرا دھمکا کر قطب شاہیوں کے مخفی دفینوں اور غیر معمولی ذرائع آمدنی کے بتانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بعض گھر کے بھیدیوں نے کچھ پتے بھی بتائے مگر کھوج لگانے سے معلوم ہوا کہ ؎

حریفاں بادہا خوردند و رفتند　　　تہی خم خانہا کردند و رفتند

اِس قسم کی کوششوں سے نا اُمید ہو کر اب کام بخش ایک اور ہی اُدھیڑبن میں

تھا کہ ٹہلتے ٹہلتے اس کی نظر اس در و دیوار شکستہ کے باقی ماندہ نقش و نگار پر ایک ایسی جگہ جم گئی جہاں کوئی غیر معمولی نقوش نظر آرہے تھے۔ اس نے فوراً دیوار کے قریب ہو کر محراب کے اوپر اپنی لکڑی سے دو چار جگہ مار کر دیکھا۔ معلوم ہوا کہ دیوار کھوکھلی ہے۔ وہ خوشی کے مارے اچھل پڑا فوراً اپنے ملازمین کو آواز دی شام تک زر و جواہر کے کئی قلمدان اس مخفی تابدان سے نکل آئے۔ کام بخش کی شادکامی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس کی ہمّت بڑھ گئی۔ اس نے جگہ جگہ دیواروں کو کھدوانا شروع کیا اگرچہ یہ دیواریں پہلے ہی عالمگیری احکام کی بناء پر توڑ پھوڑ دی گئی تھیں۔ کام بخش کی کھدوائیوں نے ان کہنہ زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا۔ اور خداداد محل کے بچے کچے نقش و نگار بھی حرف غلط کی طرح مٹا دئے گئے۔

ابھی یہ تباہ کاریاں جاری تھیں کہ ایک روز ایک کمرے میں ایک بہت بڑی چھپکلی نظر آئی۔ کام بخش کے خادموں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ تیزی سے چھت کی طرف چڑھ گئی اور ایک سوراخ میں گھس پڑی۔ اس کو وہاں سے نکالنے کی کوشش جاری تھی کہ چھت سے اشرفیاں برسنے لگیں۔

اِس غیبی امداد نے کام بخش کی ساری فکریں دور کردیں۔ اس نے اب عیش و عشرت کا بازار گرم کیا۔ اور جیسے جیسے اس کی بزم طرب کی رونق بڑھتی جاتی تھی قطب شاہیوں کی شان و شوکت اور ذوقِ لطیف کے باقی ماندہ آثار مٹتے جاتے تھے۔ اگرچہ وہ اس عظیم الشان محل کے ایک چھوٹے سے گوشہ میں مقیم تھا اور اگر وہ چاہتا تو اس حصّہ کو منہدم ہونے سے بچالیتا لیکن ایک انسان اپنے لالچ کے مقابلہ میں تہذیب و شائستگی کے بڑے سے بڑے خزانے کو بھی اہمیت نہیں دیا چاہتا۔

اس نے اپنے قیام کے لئے اپنے محل سے قریب ہی بادشاہی عاشورخانہ کے محاذی ایک حویلی کی تعمیر کا حکم دیا اور اس طرح اس عظیم الشان قطب شاہی محل کے پتھروں اور چوبینہ سے ایک چھوٹا سا مکان تعمیر کیا گیا جو قطب شاہوں کے عالیشان اور بلند محلات کے مقابلہ میں کسی غریب کی گڑیوں کا ایک بدوضع گھروندا نظر آتا تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر نہایت مدبّر اور فریس حکمران تھا۔ اس نے معلوم کر لیا کہ کام بخش کو چھوڑی ہوئی ہڈیوں سے بھی غیر متوقع دولت حاصل ہو رہی ہے تو اس کو گوارا نہ ہوا کہ اپنے حق شہنشاہی سے دست بردار ہو جائے۔ اس توقع سے کہ شہزادہ خوف زدہ ہو کر اس دولت کا کچھ نہ کچھ حصّہ اس کے یہاں ضرور روانہ کردے گا اس نے اپنے سعادت مند فرزند کو خط لکھا کہ :۔

"قطب شاہوں کے عالی شان محلات کے موجود ہوتے ہوئے اپنے لئے ایک چھوٹی سی حویلی بنانا کیا معنی رکھتا ہے ؟"

کام بخش بھی آخر اورنگ زیب ہی کا بیٹا تھا۔ اس نے ایک ایسا جواب دیا کہ باپ کو خاموش ہی رہتے بنی۔ اطاعت گذار فرزند نے لکھا کہ "قطب شاہوں کے محل ایسے وسیع اور عظیم الشان ہیں کہ ان میں رہ کر ان کو بارونق رکھنا اور ان میں روشنی کا انتظام کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ انہی صاحب ہمت بادشاہوں کا حوصلہ تھا کہ انھوں نے بڑے بڑے محلوں کو رشک فردوس بنا رکھا تھا۔"

ابھی شہزادہ کام بخش خداداد محل ہی میں مقیم تھا کہ اس کے جاسوس جو قدیم اور باخبر حیدرآبادیوں کی تلاش میں پھر رہے تھے ایک دور دراز کے گاؤں سے ایک طوائف کو پکڑ لائے۔ جب وہ کام بخش کے حضور میں پیش کی گئی تو بے اختیار

اس کی زبان سے نکلا :۔

یہ کون ہے ؟ میں نے آج تک ایسا حسن ملیح نہیں دیکھا ! کیا اس خرابہ میں ایسے ہیرے اب بھی موجود ہیں ؟"

جب اس کو مطلع کیا گیا کہ یہ ایک طوائف پیشہ عورت ہے اور دیہات والے اس کو آسمان گولکنڈہ کا آخری ستارہ سمجھتے ہیں تو کام بخش نے اس کی طرف مخاطب ہوکر پوچھا کہ :۔

"تمھارا نام کیا ہے ؟"

اُس رقاصہ نے رکتے رکتے جواب دیا کہ :۔

"اِس ناچیز کو بالاؔ کہتے ہیں !"

"بالا ! کیا تم وہی بالا ہو جس کی یاد میں شہزادہ معظم ایک زمانہ تک بے چین رہا کرتے تھے ؟"

"جی ہاں صاحب عالم میں وہی بالاؔ ہوں برگشتہ قسمت !"

"گر تم نے اتنے عرصہ تک کہاں چھپی رہیں ؟ شہزادہ معظم کے جاسوس مہینوں تمھاری تلاش میں سرگرداں رہے ! کیا تمھیں میری دلچسپیوں کی بھی خبر نہ ہوئی ۔ میں تو اس خراب آباد میں ایک اچھی مطربہ کے لئے ترس گیا اور اب تو ناامید بھی ہو چکا تھا ۔ کیا اچھا ہو کہ ابھی گرمیٔ بزم کا سامان ہو جائے کوئی اچھی سی چیز سناؤ کہ ہم بھی خوش ہو جائیں"۔

بالاؔ نے دم سرد بھر کر کہا :۔

"صاحب عالم ! ابھی آپ گرم وسرد زمانہ سے واقف نہیں ہیں ۔ ایک خفتہ بخت

دکھیا سے کیونکر توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی کی بزم کو گرما سکے گی۔ میں اس قابل نہیں ہوں، اور اگر ہوتی بھی تو یقین مانئے کہ دنیا کی کوئی قوت مجھے اس جگہ گانے پر مجبور نہ کر سکتی۔ پھوٹ جائیں یہ منحوس آنکھیں جنھوں نے کبھی اس جگہ کو رشکِ ارم دیکھا تھا اور آج اس ویران حالت میں دیکھ رہی ہیں........ صاحب عالم مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھے ہر طرح سے مجبور کرنا چاہیں گے لیکن آخر میری مجبوری بھی تو قابل لحاظ ہے! میں صاف صاف کہدینا چاہتی ہوں کہ اگرچہ میں ایک ادنےٰ طوائف ہوں لیکن اپنے دل اور اپنے جذبۂ وفاداری سے مجبور ہوں۔ میں نے جب کبھی اس محل میں قدم رکھا اپنی محبوب ملکہ کے قدمبوس ہونے کے لئے آئی تھی۔ وہ منظر میری آنکھوں میں اب بھی موجود ہے جب شہنشاہ عالمگیر نے بیجاپور کو فتح کر کے گولکنڈہ کا رُخ کیا تھا اور یہ منحوس خبر اس وقت ملکہ کے گوش گذار ہوئی تھی جب کہ انھوں نے اپنی سالگرہ کی تقریب میں میرے آقا مادنّا دیوان سے فرمایش کر کے مجھے چوتھی بار محل میں طلب کیا تھا اور میرا مجرئی سُن رہی تھیں۔ چنانچہ جونہی وہ منحوس خبر انھوں نے سنی میری طرف مخاطب ہو کر اندوہناک انداز میں فرمایا: لو بالا اب تو ہم یہاں سے جاتے ہیں۔ تم رہو گی اور کسی روز اسی جگہ ہمارے دشمنوں کی بزمِ طرب کو بھی گرماؤ گی"۔

میں اور میری نائکہ دونوں نے آگے بڑھ کر اپنی ملکہ کی بلائیں لیں اور کہا:۔

"مالکنی ہم جیسی ہزاروں لونڈیاں آپ پر سے قربان ہو جائیں۔ آپ ایسا کلمہ اپنی زبان سے کیوں نکالتی ہیں؟ گونگی ہو جائے وہ زبان جو آپ کے بعد اس جگہ کوئی راگ الاپے، اور کٹ جائے وہ گلا جو کسی اور کے لئے اس محل میں آواز........"

بالا کے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ بُری طرح بل کھا کر گری۔ وہ دالان کی سب سے بلند سیڑھی پر کھڑی تھی اور قبل اس کے کہ کوئی شخص اس کو تھامے دالان کی سیڑھیوں پر سے گرتی ہوئی نیچے صحن تک پہنچ گئی۔ اس کی گردن اور کمر میں سخت چوٹ آئی۔ شہزادہ نے حکم دیا کہ بالا کو اس کے اصلی مکان میں ٹھہرایا جائے اور شاہی طبیب اس کا معالجہ کریں۔ اس حادثہ کا بالا پر اتنا اثر ہوا کہ وہ عرصہ تک بستر علالت پر دراز رہی۔

اس اثنار میں خود شہزادہ اُس راہ سے گزرتے ہوئے دو چار دفعہ اس کے مکان پر بھی اس کی عیادت کے لئے ٹھہرا۔ جب وہ اچھی طرح صحت مند ہوگئی تو کام بخش شاہی محل چھوڑ کر اپنی جدید حویلی میں منتقل ہو چکا تھا۔ اب اس نے بالا کو بلا بھیجا اور گانے کی فرمائش کی۔ اس اثنار میں بالا جواں سال شہزادہ کے حسن اخلاق، شگفتہ مزاجی اور رعبِ مردانہ سے متاثر ہو چکی تھی اس کے علاوہ انکار کرنے کی یوں بھی کوئی وجہ باقی نہ رہی تھی۔ اس نے بسر وچشم منظور کر لیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ شہزادہ اس کے رقص و سرود سے خوش ہو کر اس کو کوئی انعام واکرام نہ دے۔

کام بخش بالا کے کمال فن سے اتنا محظوظ ہو کہ اس کے واپس جانے کے بعد شایانِ شان انعام واکرام سے سرفراز کرنا چاہا اور جب اس کے ملازمین اس سرفرازی کے ساتھ اس کے مکان پر پہنچے تو اس نے شاہی خدمتگاروں کو جوں کا توں واپس کر دیا۔ سبھوں نے اس کو سمجھایا کہ یہ نہ صرف سوءِ ادب ہے بلکہ خلاف مصلحت بھی۔ مگر بالا کب ماننے والی تھی۔ اس نے صاف صاف انکار کر دیا اور کہلوا بھیجا کہ:-

"فسخ معاہدہ کرنا شاہزادوں کے شایانِ شان نہیں ہے۔"

کام بخش حیران تھا۔ اور اس کی حیرانی رفتہ رفتہ غصہ میں تبدیل ہوتی گئی۔ ایک شہزادہ کے لئے اس سے بڑھ کر ذلت اور کیا ہو سکتی تھی۔ اس کو ایسی عجیب وغریب ذہنیت کی رقاصہ سے پہلی ہی بار سابقہ پڑا تھا۔ لیکن بالا کی شخصیت اور غیر معمولی حسن وجمال نے اس کو

ضبط سے کام لینے پر مجبور کیا۔ چند روز بعد اس نے اس مغرور رقاصہ کو سرِ دربار طلب کیا اور پوچھا کہ :-

"تم سے ایسی نازیبا حرکت کیونکر سرزد ہوئی ؟ اگر تمھاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو سخت سے سخت سزا پاتا۔ میں حیران ہوں کہ تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے ؟"

بالا نے شہزادہ کے غصہ کو بڑھتا ہوا دیکھ کر دست بستہ عرض کیا :-

"حضور قصور معاف اگرچہ اصل میں قصور میرا نہیں ہے۔ میں نے تو پہلے ہی سے شرط منظور کرالی تھی کہ صاحبِ عالم سرفراز فرمانے کا خیال نہ فرماویں تو مجرے کے لئے حاضر ہوں!"

شہزادہ نے خشمگیں ہو کر کہا :-

"مگر شاہی انعام و اکرام قبول نہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کی آخر کوئی وجہ بھی ہو؟"

"حضور اگر یہی وجہ پہلے ہی شرط منظور کرتے وقت دریافت فرما لیتے تو آج بات اس حد تک نہ پہنچتی۔ اب بھی میں اصل وجہ کہنے تیار ہوں بشرطیکہ ناگوار خاطر نہ ہو"

شہزادہ نے بات کاٹ کر کہا :-

"اس واقعہ سے بڑھ کر بھی ناگوارِ خاطر کوئی اور بات باقی ہے ؟"

بالا نے مودبانہ انداز میں کہا :-

"صاحبِ عالم! ناگوار اور گوارا کے درمیان کوئی حدِ فاصل بھی ہے! ایک ہی بات کسی وقت ناگوارِ خاطر ہو جاتی ہے اور کسی وقت گوارا کرلی جاتی

ہے۔ اس کا تعلق کسی بات یا چیز سے زیادہ گوارہ یا ناگوارہ سمجھنے والے کی کیفیت اور حالت پر منحصر ہے۔"

بالا کی طرز گفتگو اور حسن وجمال کی موہنی کچھ ایسی تھی کہ شہزادہ کے دل کو اس نے پھر سے موہ لیا۔ اس نے نہایت اخلاق سے پوچھا:۔

"میں اصل وجہ معلوم کرنے کا کئی روز سے مشتاق ہوں بہتر یہ ہے کہ تم منطقی بحثوں کے بجائے وہی بیان کرو وجوہات سچی ہے۔"

بالا نے مجبور ہو کر بادلِ ناخواستہ کہا:۔

"حضور یہ بھی کوئی کم بے ادبی کی بات نہیں ہے مگر حکم محکم سے مجبور ہوں۔ جس وقت مجھے یہ معلوم ہوا کہ شہنشاہ اورنگ زیب نے فتح گولکنڈہ کے بعد میری ملکہ یعنی زوجہ تاناشاہ بادشاہ کو اپنا امیدوار فضل وکرم بنا کر پچیس ۲۵ روپے جلینی ماہوار مقرر کی ہے اسی وقت سے قسم کھائی ہے کہ آئندہ سے کبھی کسی سے کوئی رقم نہ لوں گی۔ صاحبِ عالم ملکہ گولکنڈہ اور..... صرف پچیس روپے ماہوار! شہنشاہ کو شاید یہ خبر نہ تھی کہ ایک ایک وقت میں ہم جیسی کنیزوں کو ایسا انعام سرفراز کیا کرتی تھیں کہ اس سے ہم تمام عمر کے لئے خوشحال ہو جاتیں اور صرف ایک وقت کا انعام اتنا ہوتا کہ اس سے پچیس روپے ماہوار پانے والے بیسیوں ملازم ہمیشہ کے لئے مامور کئے جا سکتے تھے۔ جس ملکہ نے ایسی داد و دہش کی ہو اس کو صرف پچیس روپے جلینی ماہوار مقرر کرنے سے جو روحانی صدمہ ہوا ہو گا اس کا اندازہ آپ شاید ہی کر سکیں۔ اس واقعہ سے ہم لونڈیوں کے دل پر ایسا زخم لگا ہے جو تادمِ واپسیں ہرا رہے گا۔ حضور ہم کیونکر انعام واکرام قبول

کریں جب معلوم ہے کہ ہماری انعام واکرام سے سرفراز کرنے والی آج پچیس[۲۵]
روپے جلینی میں زندگی بسر کررہی ہے!"

کام بخش پر اس دردناک بیان کا اتنا اثر ہوا کہ وہ فوراً مجلس سے اُٹھ گیا۔ غمزدہ بالا بھی روتی ہوئی اپنے مکان کو واپس ہوئی۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد کام بخش کی سالگرہ کی تقریب بڑی دھوم دھام سے منائی گئی اور اس جشن میں بالا نے شہزادہ کو اپنے کمالات سے اور بھی مسحور کردیا۔ اب ان دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا تھا۔ جواں سال شہزادہ کے مردانہ حسن اور رنگین طبیعت نے ماہ پیکر بالا کے شباب کی بجھتی ہوئی چنگاریوں کو چمکا دیا۔ وہ عہد ماضی کو بھول چکی تھی۔ مادنا کا بھتیجا جس کا گوشۂ خلوت گرم کرنے کے لئے وہ تیار کی گئی تھی اب اس کے لئے خواب وخیال ہوتا جارہا تھا۔ حیدرآباد آنے کے بعد پوچھ گچھ اور تلاش و جستجو سے اس کو معلوم ہوگیا تھا کہ شہزادہ معظم کے سپاہیوں نے فتح گولکنڈہ کے بعد سب سے پہلے اسی بدقسمت نوجوان کو قتل کیا تھا۔ ورنہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ شاید وہ بھی اس کی طرح کہیں روپوش ہے اور ایک نہ ایک روز اس سے ضرور آملے گا جب وہ کئی سال قبل رات کی تاریکی میں اورنگ زیب کے حکم سے مغل فوج کے پڑاوے سے باہر نکل رہی تھی تو بار بار پلٹ پلٹ کر قلعہ گولکنڈہ کی طرف دیکھتی جاتی تھی دور پہنچکر جب مشک محل کے قریب سے اس نے گولکنڈہ کی طرف نظر ڈالی تو تاریک آسمان کے نیچے اس کو ایک منور آسمان دکھائی دیا۔ جس پر جگہ جگہ قطب شاہی محلات، بالا حصار کی عمارتوں، امراء و عمائدین کے مکانوں اور بارونق بازاروں کے چراغ ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ انہی روشن ستاروں میں اس کے نوجوان محبوب اور اس کے دھڑکتے ہوئے دل کے مالک کے مکان کا چراغ بھی تھا۔ جس کا خیال آتے ہی اس نے اپنے فرقت زدہ دل کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اس کو توقع تھی کہ وہ بہت جلد اس رشکِ فردوس قلعہ کو واپس آئے گی اور اپنے محبوب کے دیدار سے اپنی آنکھوں کو منور کرسکیگی۔ مگر وہ اس وقت تک انقلاباتِ دہر سے ناآشنا تھی۔ اُس کو

کیا خبر تھی کہ جب دوبارہ اس کی نظر گولکنڈہ پر پڑے گی تو یہ منتخب روزگار آبادی ایک کھنڈر سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہوگی چنانچہ کئی سال بعد جب یہ شام وہ کام بخش کے سپاہیوں کے جھرمٹ میں قیدی کی طرح حیدر آباد آرہی تھی تو راستہ میں دور سے اس کو ایک خاک کا بلند تودہ آسمان کی طرف اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ:۔

"یہ کون مقام ہے؟ ہم اب کس طرف کو جا رہے ہیں؟"

کام بخش کے سپاہیوں نے تمسخرانہ لہجہ میں جواب دیا:۔

"یہی تو وہ گولکنڈہ ہے جس پر تم لوگوں کو اتنا ناز ہے۔"

۳

جب شہزادہ معظم کو بالا کے حیدر آباد میں موجود ہونے کی خبر پہنچی تو اس نے اپنے آدمی روانہ کئے اور کہلا بھیجا کہ:۔

"تمہارا گذشتہ قصور معاف کر دیا جاتا ہے۔ اگر تم اپنی خیر چاہتی ہو تو ان کے ہمراہ فوراً چلی آؤ ورنہ سخت باز پرس کی جائے گی۔"

بالا نے جواب دیا:۔

"میں برسوں کے بعد ابھی حیدر آباد آئی ہوں اور اب تو مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ پھر جیتے جی یہاں سے نکلوں۔"

اس اثنا میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی کا انتقال ہو گیا اور اس کے ہر فرزند نے اپنی اپنی جگہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ کام بخش کے جشنِ تخت نشینی میں بالا نے دل کھول کر اپنے کمالاتِ رقص و سرود دکھائے وہ مسرور تھی کہ حیدر آباد پھر سے ایک بادشاہ کی تخت گاہ بن گیا ہے۔ نہ صرف بالا بلکہ تمام اہلِ حیدر آباد کو اس کی مسرت تھی کہ ان کے ملک میں پھر سے بادشاہی کا آغاز ہوگا۔ کام بخش اپنے زمانۂ قیام میں اس قدر ہر دلعزیز ہو چکا تھا کہ سب اس کو

اپنا پاؤں شاہ تصور کرنے لگے تھے اور چاہتے تھے کہ اکی سلطنت کو استحکام ہو اور اسکے ذریعہ سے دوبارہ حیدرآباد اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو حاصل کرے لیکن حیدرآباد کی گلیوں اور سڑکوں کی قسمت میں تو ابھی کئی دفعہ اجڑنا اور برباد ہونا لکھا تھا۔ امن وعافیت کا زیادہ زمانہ گذرنے نہیں پایا تھا کہ شہزادہ معظم نے کام بخش کو اپنی اطاعت قبول کرنے کی دھمکی دی اور تاکید کی کہ بالا کو فوراً اس کے یہاں روانہ کردیا جائے شہزادہ کام بخش ان دونوں فرمائیشات کی تکمیل کرنے سے منعذر تھا۔ اس نے صاف انکار کردیا۔ حیدرآباد جیسی سلطنت اور بالا جیسی حسن کی دیوی ہر صاحب ہمت کو نصیب نہیں ہوسکتی۔ کام بخش کو دونوں ایک سے بڑھکر ایک عزیز تھیں۔ اسنے آخر دم تک انکو قبضہ میں رکھنے کی کوشش کی جس وقت معظم کی لاتعداد فوجیں ایک طوفانی سمندر کی موجوں کی طرح شہر حیدرآباد کی فصیلوں سے آآکر ٹکرا رہی تھیں شہزادہ کام بخش کی بہادری اور ماہ پیکر بالا کی فراست ایک مستحکم پہاڑی ساحل بن کران کو واپس ہونے پر مجبور کررہی تھی۔ لیکن حملہ آور شہزادہ کے ساتھ دکن میں تمام ہندوستان کی فوجیں اور قوتیں کھنچی چلی آرہی تھی اگرچہ غریب کام بخش نے مغلوں کے ان ٹڈی دل افواج کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ مگر اس کی قسمت میں لکھا تھا کہ اپنی پیاری بالا کے وطن کو اپنے خون سے رنگین کرے۔

ادہر مظفر ومنصور شہزادہ کی فوجیں شہر حیدرآباد میں داخل ہورہی تھیں۔ ادہر آسمان گولکنڈہ کا آخری تارہ غروب ہورہا تھا۔ معظم نے شہر کا چپہ چپہ ڈھونڈہ ڈالا مگر بالا نہ ملنا تھی نہ ملی اور وہ ایسی غائب ہوئی کہ پھر کسی کو اس کا پتہ نہ چلا۔

معظم کی فتح اور تسخیر حیدرآباد کے چند روز بعد ہی اس کی فوج کے ایک بوڑھے سپاہی کو حیدرآباد کے مشہور محلہ بارہ گلی میں ایک غریب شخص ملا جس نے اسکو روک کر ہیرے کی ایک گراں بہا انگوٹھی پیش کی اور کہا:

”بالا نے محاصرہ گولکنڈہ کے زمانہ میں تم سے جس انعام کا وعدہ کیا تھا اسکے ایفا کا برسوں کے بعد آج موقعہ لا ہے“

بوڑہا سپاہی ہیرے کی انگوٹھی دیکھ رہا تھا اور اس کا عالم سراسیگی ابھی ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ وہ غریب شخص قریب کی گلی میں داخل ہوکر آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔